مزید خامہ بگوشیاں

(ادبی کالم)

مشفق خواجہ

مرتبین:

ڈاکٹر انور سدید

خواجہ عبدالرحمن طارق

مقتدرہ قومی زبان

پاکستان

www.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مزید خامہ بگوشیاں

(ادبی کالم)

مشفق خواجہ

مرتبین:

ڈاکٹر انور سدید

خواجہ عبدالرحمٰن طارق

مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

۲۰۱۲

Scanning Project 2015

Book No.105

Donated By:
Rashid Ashraf

Special Courtesy :
Salman Siddqui
Amin Tirmizi

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

جملہ حقوق بحق مقتدرہ قومی زبان محفوظ ہیں

سلسلہ اشتراک وتعاون: ۰۲

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN۹۷۸-۹۶۹-۳۷۴-۲۹۰-۸

☆

طبع اوّل ۲۰۱۲ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ..... =/۳۰۰ روپے

فنی تدوین ..... صفدر رشید

اہتمام ..... پورب اکادمی، اسلام آباد، ۰۵۱-۲۲۱۰۱۰۱

ناشر ..... ڈاکٹر انوار احمد
صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو،
پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴،
اسلام آباد، پاکستان۔
فون: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۰۸
فیکس: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۰

ای میل: ahmadanwaar49@yahoo.com

☆

یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان اور پورب اکادمی، اسلام آباد کے اشتراک وتعاون سے شائع کی جارہی ہے۔

پیش لفظ

جناب مشفق خواجہ کی کئی حیثیتیں ہمارے علمی اور ثقافتی سرمائے میں مسلم ہیں۔ وہ محقق تھے، کتاب کے شیدائی تھے۔ تشنگانِ علم کے لیے دریا دل تھے اور اپنی ذہانت، ہمدردی اور شگفتگی کو 'خامہ بگوش' کے قلمی نام سے عام لوگوں پر ارزاں بھی کر دیتے تھے۔ ان کے ادبی اور فکاہیہ کالموں میں صرف چوٹیں اور چٹکیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ علمی نکتے اور حکمت افروز باتیں بھی ہوتی تھیں۔ مقتدرہ قومی زبان کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ ہم ان کے قابلِ احترام بھائی جناب خواجہ عبدالرحمٰن طارق اور محترم ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''مزید خامہ بگوشیاں'' پورب اکیڈمی کے اشتراک سے شائع کر رہے ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر انجم حمید کی سرگردگی میں مقتدرہ میں ایک ایسا شعبہ قائم کر دیا گیا ہے جس میں وسائل کے اشتراک کی بنیاد پر کتب کی اشاعت کو ممکن بنایا جائے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمیں اہلِ علم اور اہلِ دل کا تعاون اسی طرح حاصل رہے گا، جیسے 'اخبارِ اردو' کے سالانہ خریدار بنانے کی مہم میں، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارا ادارے کی اشاعتی سرگرمیاں جہاں فروغِ علم کا وسیلہ بنیں، وہاں مقتدرہ قومی زبان سے بے پناہ توقعات رکھنے والوں کے ہجوم میں عاشقانِ باصفا کی شناخت میں بھی مددگار ہوں۔

(انوار احمد)

ای میل: ahmadanwaar49@yahoo.com
ویب گاہ: www.nla.gov.pk

اسلام آباد: ۷۔ فروری ۲۰۱۲ء

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

فہرست

پیش لفظ ڈاکٹر انوار احمد	۳
انھیں بہترین کالم نگار ہونے کی سند (مع نقد رقم) دی گئی	۹
بعض مریض حکیم صاحب کا نسخہ دیکھ کر ہی شفایاب ہو جاتے ہیں	۱۳
قلم برداشت ادب	۱۸
ادبی لے پالک	۲۷
نقاد یا بندۂ تحسین و ثنا	۲۹
تخلیقِ ادب اور اصحابی تناؤ	۳۵
اہلِ قلم یا مرفوع القلم	۴۱
ادبی سازندے	۴۷
اک جان کا زیاں	۵۳
ایک کالم ۱۹۹۴ کی یاد میں	۵۸
حاصلِ مطالعہ۔ شرمندگی!	۶۴
اعزازی ڈگری	۷۰

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ادبی خیرات	۷۶
غلط نامہ خامہ گوش	۸۱
انکشافات اور اعتراضات	۸۶
ادب یا مناجات بیوہ	۹۲
ادب یا کاسۂ گدائی	۹۷
ادبی تنقید اور ظالم سماج	۱۰۲
شاعری: مجبوری یا معذوری؟	۱۰۷
ادب و ثقافت کا رُستمِ زماں	۱۱۳
''جو رہی سو بے خبری رہی''	۱۱۸
دانشورانِ بے قلم	۱۲۳
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا	۱۲۷
تماشائی یا جز و تماشا	۱۳۵
طوافِ کوئے ملامت	۱۴۱
کشکولِ گدائی	۱۴۶
ملفوظاتِ نثر اللہ خان	۱۵۳
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ	۱۵۹
شاعری یا راگ درباری	۱۶۵
سوختنی نہ فروختنی	۱۷۲
سفرنامہ یا معذرت نامہ	۱۷۷
ادیب اور پولیس مقابلہ	۱۸۳

لوحِ ادب پر حرفِ مکرر	۱۸۹
نقاد یا اشاریہ ساز	۱۹۴
ژولیدہ بیان نقاد کا کند ذہن قاری	۱۹۹
غیر شاعرانہ شاعری	۲۰۴
شرمندہ ہیں وہ اپنے کمالوں کے سامنے	۲۱۲
کتابیں اور راگ راگنیاں	۲۱۷
حفیظ جالندھری ڈوبتے ڈوبتے بچے	۲۲۲
ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں	۲۲۵
ساقی کی شاعری ایک اچھا خاصا چڑیا گھر ہے	۲۲۹

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

انھیں بہترین کالم نگار ہونے کی سند (مع نقد رقم) دی گئی

خدا صہبا لکھنوی کی عمر اور دستِ طلب دراز کرے کہ انھوں نے ایک کام ایسا کیا ہے، جس کی اُردو ادب میں پہلے سے کوئی مثال نہیں تھی۔ اور وہ ہے مشاہیر ادب کی خدمات کا ان کی زندگی میں اعتراف۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اِدھر کوئی مقبول ادیب مرا اور اُدھر اس کی یاد میں ایک نمبر شائع ہو گیا۔ ادیب اپنی جان سے جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزا نہ آتا تھا، کیونکہ روایتی اور تعزیتی مضامین رسالے کی ضخامت بڑھانے کے لیے ہوتے ہیں، پڑھنے کے لیے نہیں ہوتے۔

صہبا لکھنوی نصف صدی سے شاعری کر رہے ہیں، مگر شعر کا کوئی نیا مضمون ان کے ذہن میں نہیں آیا، تاہم اپنے رسالے "افکار" کے حوالے سے انھیں یہ نئی بات خوب سوجھی کہ مشاہیر ادب کے مرنے کا انتظار نہ کیا جائے، ان کی زندگی ہی میں ان کے خاص نمبر نکالے جائیں۔ جوش، حفیظ، فیض اور احمد ندیم قاسمی پر انھوں نے بڑے معرکے کے نمبر شائع کیے ہیں۔ ان شاعروں کے بارے میں آئندہ کوئی صحیح تو کیا، غلط کام بھی ان نمبروں کے حوالے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

صہبا لکھنوی کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے ایڈیٹروں نے بھی زندہ ادیبوں کے بارے میں خاص نمبر شائع کیے۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ البتہ حال ہی میں سرگودھا کے رسالے "اُردو زبان" نے جو انور سدید نمبر شائع کیا ہے، وہ ایک عمدہ کام ہے اور اس کام کو صہبا لکھنوی کے کارناموں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ ہر رسالے کو پڑھنے کے بعد کہیں نہ کہیں تو رکھا ہی جاتا ہے، "اُردو زبان" کے انور سدید نمبر کو اگر "افکار" کے خاص نمبروں کے ساتھ رکھ دیا جائے، تو امید ہے صہبا لکھنوی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید ہمارے عہد کے بلند قامت ادیبوں میں سے ہیں۔ ان کی بلند قامتی پبلک ریلشنگ کی بیساکھیوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس کے لیے انھوں نے نے ۳۵ برسوں تک ادب کی مخلصانہ خدمت کی ہے۔ ایک نقاد، محقق اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے ہمارے ادب میں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

وقیع اضافے کیے ہیں۔ ایک کالم نویس کی حیثیت سے بھی انھیں منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ کئی اخبارات و رسائل میں قلمی ناموں سے لکھتے ہیں۔ یہ کالم ایک طرف تازہ ترین ادبی معلومات کا خزینہ معلوم ہوتے ہیں، تو دوسری طرف اپنے لطیف طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کی وجہ سے ادبی مسرت عام کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ حال ہی میں آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی نے انھیں ۱۹۸۹ء کا بہترین کالم نگار قرار دیا ہے۔ اس مہینے کے شروع میں ایک خصوصی تقریب میں انھیں بہترین کالم نگار ہونے کی سند (مع نقد رقم) دی گئی۔ یہ سند اور رقم کا چیک وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے دستِ مبارک سے انھیں عطا کیا۔ محترمہ کے زمانۂ اقتدار میں فی الحال نیکی کا یہی ایک کام ہوا ہے۔

''اُردو زبان'' کا انور سدید نمبر سجاد نقوی نے مرتب کیا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔ اگر وہ اتنی محنت کسی نیک کام پر کرتے، تو ان کی عاقبت سنور جاتی۔ خیر یہ بھی نیکی ہی کا کام ہے کہ ہمارے عہد کے ایک ممتاز ادیب کی شخصیت اور ادبی کاموں سے لوگ واقف ہو جائیں گے۔ سجاد نقوی نے دو درجن سے زیادہ نامور ادیبوں سے مضامین لکھوائے ہیں، جن کے مطالعے سے ڈاکٹر انور سدید کی پہلو دار شخصیت کا کوئی گوشہ اور ادبی فتوحات کا کوئی پہلو نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنی ذاتی زندگی میں نہایت محنتی، سادگی پسند اور دیانت دار ہیں۔ یہی شعار ان کا ادبی معاملات میں بھی ہے۔ اسی لیے وہ قابو چیانِ ادب سے مفاہمت نہیں کرتے اور ان کے خلاف آوازِ حق بلند کرتے رہتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں وہ کسی قدر جذباتی بھی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو وہ اپنا ادبی گرو مانتے ہیں اور ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی بات نہیں سن سکتے۔ ادھر ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف کسی نے کوئی بات کہی، ادھر انور سدید کی تلوار بے نیام ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ قلم سے تلوار ہی کا کام لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے، جن میں ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل ہیں، ڈاکٹر انور سدید کو بہت سمجھایا کہ فضول اعتراض کرنے والوں کی تحریروں کا جواب دینا تضیعِ اوقات ہے، لیکن موصوف کسی کی نہیں سنتے اور اپنی روش پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے بھی انھیں ڈاکٹر وزیر آغا کی موجودگی میں سمجھایا اور یہ تک کہا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی حیثیت اتنی مستحکم ہے کہ مخالفوں کی تحریروں سے انھیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے نہ حمایتیوں کی تحریروں سے کوئی فائدہ۔ ڈاکٹر انور سدید نے جواب دیا، ''میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں کوئی غلط بیانی سن کر اپنا ردِ عمل ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے میں ہر مخالفانہ تحریر کا جواب

ضرور لکھتا ہوں.....'' ہم نے عرض کیا، ''آپ جواب لکھ کر ہمیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کو بھیج دیا کیجیے، چھپوانے کی کیا ضرورت ہے۔'' کہنے لگے، ''میں اس قسم کے مضامین آپ کے لیے یا ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے نہیں لکھتا۔'' اس کے بعد، ظاہر ہے، کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی۔

زیرِ نظر خاص نمبر کے تقریباً ہر صفحے پر ڈاکٹر وزیر آغا کا نام ملتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ نمبر جتنا ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں ہے، اتنا ہی ڈاکٹر وزیر آغا سے متعلق بھی ہے۔ ''من تو شدم تو من شدی'' کی ایسی مثال شاید ہی کوئی مل سکے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ افتتاحی مضمون انھیں کا ہوگا، جس میں ڈاکٹر انور سدید کی علمی و ادبی خدمات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ دوستانہ مراسم کی تفصیل بھی ہو گی۔ معلوم نہیں ''اُردو زبان'' کے ایڈیٹر نے ڈاکٹر وزیر آغا سے مضمون کی فرمائش نہیں کی یا خود ڈاکٹر صاحب نے فرمائش کو ٹال دیا۔ پہلی صورت میں ایڈیٹر کی تنگ نظری پر افسوس کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں ڈاکٹر وزیر آغا کو ان کی مصلحت اندیشی کی داد دینی چاہیے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون میں یہ ضرور لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید ان کے دفاع میں مضامین لکھ کر ان کے مخالفوں کو خواہ مخواہ اہمیت دے رہے ہیں۔ انھیں اس کام میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر انور سدید اس مضمون کو پڑھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف بھی ایک مضمون لکھ دیتے ہیں جس کا مرکزی خیال یہ ہوتا، ''میں پسند نہیں کرتا کہ ڈاکٹر وزیر آغا اس معاملے میں دخل اندازی کریں، میں بہتر طور پر جانتا ہوں کہ ان کے مخالفوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا چاہیے.....'' اور یوں گرو اور چیلے میں نظریاتی اختلاف کی بنیاد پڑ جاتی اور دونوں کے مخالفین کو بغلیں بجانے کا موقع مل جاتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ڈاکٹر انور سدید پر مضمون نہ لکھ کر مخالفوں کو بغلیں بجانے سے باز رکھا ہے۔ ہم نے آغا صاحب کو اسی مصلحت اندیشی کی داد دی ہے۔

یوں تو اس نمبر کے تقریباً سبھی مضامین پڑھنے کے لائق ہیں، لیکن ہمیں سب سے زیادہ ڈاکٹر انور سدید کا انٹرویو پسند آیا ہے۔ یہ انٹرویو حسن رضوی نے لیا ہے۔ ان کے سوال بڑے چار خانہ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے جواب بھی خاصے تیز ہیں۔ حسن رضوی نے ڈاکٹر صاحب کو مشتعل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے مشتعل ہوئے بغیر اپنے ناپسندیدہ ادیبوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ انھیں پڑھ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ ہم

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ڈاکٹر صاحب کے ناپسندیدہ افراد میں شامل نہیں ہیں۔ حسن رضوی نے جو سوال کیے، ان میں سے چند بطور نمونہ کلام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سوال: ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ صرف ایسے ادیبوں کو انشائیہ نگار مانتے ہیں، جن کا تعلق آپ کے حلقے سے ہے اور اس طرح آپ ادب میں خویش پروری اور اقربا نوازی کے مرتکب ہیں؟''

سوال: ''آپ نے آج تک اپنے دفاع میں اتنا کچھ نہیں لکھا ہے جتنا ڈاکٹر وزیر آغا کے دفاع میں۔ اور شاید اسی وجہ سے لوگوں نے آپ کو ڈاکٹر وزیر آغا کے مزارع کا خطاب دیا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا پر کی گئی تنقید کا ہمیشہ آپ ہی جواب دیتے ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب خاموش رہتے ہیں؟''

سوال: ''آپ اپنے مخالفین کی تنقید کے جواب میں فارقلیط، قلم بردار، کودا اندیش، مرزا غالب، ابن السبیل، ابن قلم اور نہ جانے کتنے قلمی ناموں سے لکھتے ہیں۔ کیا یہ نام کسی خود ساختہ قلمی خوف کا نتیجہ ہیں؟''

ڈاکٹر انور سدید کی گل افشانی گفتار کے کچھ نمونے بھی دیکھ لینے چاہئیں۔

''ہمارے بہت سے ادبا اشتہاری شہرت کی چاندنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس رویّے کو ایک خاص مقصد کے تحت فروغ دیا جا رہا ہے۔ مقصد ادب اور تخلیق کی بجائے ادیب کی ذات کی تزئین و تجلیل ہے۔ لیکن جب کسی عظیم شخصیت کے نمائشی ماؤنٹ ایورسٹ سے چوہا بھی برآمد نہیں ہوتا اور مہارشی کے پردے سے راسپوٹین نکل آتا ہے، تو ادب کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ معصوم قاری کا ادب سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔''

''وزیر آغا اپنے خلاف لکھے گئے دشنام کے پشتاروں کو پڑھتے ہی نہیں۔ لیکن مجھے یہ سب کچھ پڑھنے میں بہت مزا آتا ہے اور جواب لکھ کر بھی عجیب سا انبساط و سرور حاصل کرتا ہوں۔ شاید یہ میرے راجپوتی خون کا اثر ہے کہ کسی دوست کے محاذ پر لڑنا مجھے عین سعادت نظر آتا ہے۔ یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی ہے۔ اس سے میرا اکھاڑ کس ہو جاتا ہے۔ نہ لکھوں تو شاید بیمار پڑ جاؤں۔ ادبی جنگ جتنی لمبی ہو جائے، مجھے اتنی ہی پُر لطف محسوس ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، خدا کرے رقیبوں کا انتقال نہ ہو۔ خدا انہیں عمرِ خضر عطا کرے۔''

بعض مریض حکیم صاحب کا نسخہ دیکھ کر ہی شفایاب ہو جاتے ہیں

استاد لاغر مراد آبادی کو زبان اور قواعد زبان کے مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی لسانی گتھی کو سلجھاتے یا الجھاتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہایت سخت گیر ہیں۔ لوگوں کے اعمال کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، زبان کی غلطیوں کو معاف نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے، لفظ ''وزیر اعظم'' مذکر ہے لیکن آج کل اسے مونث کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ افسوسناک غلطی ہے۔'' ہم نے عرض کیا، آج کل جہاں بے شمار غلطیاں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں، وہاں ایک غلطی یہ بھی سہی۔ کہنے لگے۔ ''یہ زبان و قواعد کا معاملہ ہے، سیاست کا نہیں جو ہر طرح کی بے اصولی جائز ہو۔''

اس طرح ایک روز فرمایا، ''حکیم محمد سعید کو عموماً صیغۂ واحد سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ صیغۂ جمع بلکہ جمع الجمع ہے۔'' ہم نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا، ''یہ کیسے ممکن ہے کہ حکیم صاحب کے حوالے سے زبان کی کوئی غلطی سرزد ہو۔ وہ دلی کے روڑے نہیں، مونام ہیں۔ اردو زبان ان کے دواخانہ میں بطور تریاق استعمال ہوتی ہے (کاتب صاحب! ''تریاق'' کو ''تریاک'' نہ لکھ دیجئے گا)۔ وہ ایسی عمدہ اُردو لکھتے ہیں بعض مریض ان کا نسخہ دیکھ کر ہی شفایاب ہو جاتے ہیں۔'' اس کے جواب میں استاد نے فرمایا۔ ''غلطی حکیم صاحب کی نہیں، عام لوگوں کی ہے کہ وہ حکیم صاحب کو جمع کی بجائے واحد کے صیغے میں رکھتے ہیں۔'' ہم نے جب اس اجمال کی تفصیل چاہی تو فرمایا ''حکیم محمد سعید ایک شخص کا نام نہیں، مجموعۂ اشخاص کا نام ہے۔'' ہم نے عرض کیا، ''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ پورے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں اس نام کے ایک ہی صاحب ہیں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ان کا صیغۂ واحد میں ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلکہ ان کی سفید شیروانی کو بھی صیغۂ واحد میں سمجھنا چاہیے کیونکہ سارا سال وہ ایک ہی شیروانی میں نظر آتے ہیں۔" فرمایا، "شیروانی ایک ہو سکتی ہے، لیکن حکیم صاحب کئی ہیں جو باری باری اس شیروانی کو استعمال کرتے ہوں گے۔" انھوں نے مزید وضاحت فرمائی۔ "حکیم صاحب جتنا کام کر رہے ہیں، وہ ایک آدمی کے بس کا نہیں۔ دراصل حکیم محمد سعید نام کے کئی شخص ہیں، ایک مدینۃ الحکمت بنا رہا ہے، دوسرا ہمدرد کا کاروبار چلا رہا ہے، تیسرا کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں ہر ہفتے سینکڑوں مریضوں کی نبض ٹٹولتا ہے۔ چوتھا آئے دن قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتا رہتا ہے۔ پانچواں شادی بیاہ کی اور دیگر سماجی تقریبات کی رونق بڑھاتا رہتا ہے۔ چھٹا سال میں دو تین کتابیں اور درجنوں مضامین لکھتا ہے۔ ساتواں آوازۂ اخلاق بلند کرتا ہے۔ سات حکیم صاحب تو یہ ہوئے۔ مزید تحقیق سے اتنے ہی اور نکل آئیں گے۔"

استاد اخگر مراد آبادی قواعد زبان کے حوالے سے جس نتیجہ تک پہنچے ہیں، اس سے اختلاف ممکن نہیں، کیونکہ حکیم صاحب کے کاموں بلکہ کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسے دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ حکیم صاحب آدمی نہیں ہیں، جن ہیں اور جن بھی ایسا جو شربت روح افزا کی بوتل سے نکل کر خود بھی سرگرم عمل رہتا ہے اور دوسروں کو بھی کام سے لگائے رکھتا ہے۔ حکیم صاحب کو کام سے اس حد تک عشق ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کام بڑا ہے یا چھوٹا، ان کا مسلک یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ حکیم صاحب عموماً بڑے بڑے کاموں ہی میں ہاتھ ڈالتے ہیں، لیکن موقع مل جائے تو چھوٹے کاموں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مطبوعہ روزنامچے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے کپڑے بھی خود دھوتے ہیں۔ اس پر ہم نے انھیں خط لکھا تھا کہ آپ قومی بھلائی کے اتنے کام کر رہے ہیں، وہیں ایک لانڈری بھی کھول لیجیے، تاکہ ہم جیسے نیازمند بھی اُجلے کپڑے زیب تن کر سکیں۔

حکیم صاحب سے ہمیں براہ راست نیازمندی کا شرف حاصل نہیں ہے۔ البتہ ان کے مریض خصوصی مسعود احمد برکاتی ہمارے کرم فرما ہیں۔ برکاتی صاحب کو مریض خصوصی ہم نے اس لیے کہا ہے کہ انھوں نے ادارۂ ہمدرد کی اتنی خدمت کی ہے کہ اپنی صحت کو بگاڑ لیا ہے، حالانکہ وہ جس عہدے پر فائز ہیں، وہاں صرف عادتیں بگڑنے کی گنجائش ہے۔ برکاتی صاحب جب بھی ملتے

ہیں، ان کے ہاتھوں میں حکیم صاحب کی کوئی نہ کوئی نئی کتاب ضرور ہوتی ہے اور وہ اپنے ہاتھوں کا بوجھ ہمارے سر پر ڈال دیتے ہیں۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ حکیم صاحب کی تقریباً ہر تصنیف ہمارے پاس موجود ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ برکاتی صاحب نے کبھی کسی کتاب کے ساتھ کوئی مفرح قلب اور مقوی دماغ دوا عنایت نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ہم ان کتابوں سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکے۔ برکاتی صاحب ہمیشہ تبصرہ نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں، لیکن ہماری مجبوری پر نظر نہیں کرتے۔ ایک دن ہم نے انھیں صاف صاف بتا دیا کہ ضخیم کتابیں پڑھنے کے لیے جس اہلیت و صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ ہم میں موجود نہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے حکیم صاحب کا ایک مختصر مضمون عنایت کیا اور فرمایا۔ "یہ چند سطروں کا مضمون تو آپ پڑھ سکتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کر دیجیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ میں لکھنے کی اہلیت و صلاحیت بھی موجود ہے یا نہیں۔"

ہم نے یہ مضمون پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ حکیم صاحب نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہی ہیں۔ اس مختصر مضمون کو تھوڑا سا اور مختصر کر کے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ عنوان ہے "کاغذ کی قدر پہچانو۔"

"کاغذ کا ایک پرزہ! کتنی معمولی، کتنی حقیر سی چیز۔ کون پرواہ کرتا ہے کہ اس ٹکڑے کو سنبھال کر رکھے، لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس کاغذ میں کتنی بڑی قوت پوشیدہ ہے۔ کاغذ کے بغیر بہت سے کام رک جاتے ہیں۔ کاغذ انسان کے خیالات کا امین ہے۔ کاغذ پر معاہدے لکھے جاتے ہیں کاغذ پر رسید لکھی جاتی ہے۔ کاغذ پر حکم لکھا جاتا ہے۔ کاغذ پر درخواست لکھی جاتی ہے۔ کاغذ پر حساب لکھا جاتا ہے۔ کاغذ پر اخبار چھپتے ہیں۔ کاغذ پر رسالے طبع ہوتے ہیں۔ کاغذ ہر قدم پر ہمارے کام آتا ہے۔ کاغذ ہر کام میں ہماری مدد کرتا ہے۔ کاغذ ہماری زندگی کی حفاظت کرتا ہے۔ کاغذ ہمیں سزا سے بچاتا ہے۔ کاغذ ہمیں انعام دلواتا ہے۔ کاغذ ہمیں حقوق دلواتا ہے۔ کاغذ ہمیں فرائض یاد دلاتا ہے۔ کاغذ کے ذریعے سے ہم حکومت کرتے ہیں۔ آج کاغذ ملنا بند ہو جائے تو ہم کیا کریں گے۔ آج دنیا کے تمام کام کاغذ کی مدد سے انجام پا رہے ہیں۔ اس لیے کاغذ کی ضرورت بڑھ رہی ہے اور کاغذ کی پیداوار کم ہے۔ کاغذ کی حفاظت کرو۔ کاغذ کی کفایت کرو۔ کفایت بڑی اچھی چیز ہے۔ کاغذ کو ضائع نہ کرو۔"

حکیم صاحب کے ارشادات سر آنکھوں پر، لیکن ہمارا تجربہ قدرے مختلف ہے۔ ہم نے تو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

یہی دیکھا ہے کہ کاغذ سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز کوئی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سادہ کاغذ بے ضرر ہوتا ہے، اور جب تک اس پر کچھ نہ لکھا جائے، یہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ لیکن کاغذ کو سادہ کوئی نہیں رہنے دیتا۔ افسانہ نگار اس پر افسانے لکھتے ہیں۔ شاعر نظمیں اور غزلیں رقم کرتے ہیں۔ صحافی خبریں اور اداریے تحریر کرتے ہیں۔ یہ سب ایک طرف کاغذ کو اور دوسری طرف پڑھنے والوں کی ذہنی سکون کو غارت کرنے کی تدبیر ہیں۔

اگر کاغذ پر ہم مضمون لکھتے تو حکیم صاحب سے الفاظ مستعار لیکر اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر اس طرح لکھتے۔

"کاغذ کے بغیر بہت سے غلط کام رُک جاتے ہیں۔ کاغذ انسان کے فاسد خیالات کا امین ہے۔ کاغذ پر معاہدے لکھے جاتے ہیں، جن کی کوئی پابندی نہیں کرتا۔ کاغذ پر رسیدیں لکھی جاتی ہیں جو عموماً جعلی ہوتی ہیں۔ کاغذ پر حکم لکھا جاتا ہے جس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ کاغذ پر درخواست لکھی جاتی ہے، جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کاغذ پر حساب لکھا جاتا ہے، جو انکم ٹیکس والوں کو دکھانے کے لیے ہوتا ہے اور جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کاغذ پر اخبار چھپتے ہیں، جن میں سے بعض غلط اور جانبدار خبروں سے لوگوں کا ذہنی سکون برباد کرتے ہیں اور بعض پریس سے سیدھے ردی فروخت کرنے والوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ کاغذ پر رسالے طبع ہوتے ہیں، جنھیں ردی فروخت کرنے والے بھی نہیں خریدتے۔ کاغذ پر ہمارا نامۂ اعمال لکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم پکڑے جاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں۔ کاغذ پر پولیس والے اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں، جس سے قصور وار بچ جاتے ہیں اور بے قصور پکڑے جاتے ہیں۔ کاغذ پر سیاست دان اپنی تقریریں لکھتے ہیں، جن میں لفظوں کے وہ معنی نہیں ہوتے، جو لغات میں درج ہیں۔"

حکیم صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں کاغذ کو ضائع نہ کرنے کا جو مشورہ دیا ہے، اس سے ہمیں صدفی صد اتفاق ہے۔ کاغذ بذاتِ خود بری چیز نہیں، لیکن فی زمانہ اس کے استعمال نے اسے بدنام کر دیا ہے۔ اگر صرف ادب ہی کے حوالے سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ہر روز منوں کے حساب سے کاغذ ضائع ہو رہا ہے۔ بقول شخصے اسی گرام کے کاغذ پر ایسی شاعری چھپتی ہے، جو وزن کے اعتبار سے پانچ گرام کی بھی نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار اپنے مجموعے کیا چھپواتے ہیں، کاغذ کی ناؤ بہاتے ہیں اور یہ کون نہیں جانتا کہ کاغذ کی ناؤ آج نہ ڈوبی کل ڈوبی۔ نقاد بے مزا،

جانبدارانہ اور کاغذی تنقید لکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں سطریں یوں نظر آتی ہیں، جیسے کاغذ کو دیمک چاٹ رہی ہو۔

پرانے زمانے میں جب کاغذ کمیاب تھا تو اس کی قدر ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص بیکار قسم کی کتاب لکھ دیتا تھا، تو اس کے اوراق کو دھو کر دوبارہ استعمال میں لایا جاتا تھا۔ مگر آج کل مشینوں کی طباعت کی وجہ سے کاغذ پر ایک مرتبہ جو چھپ جاتا ہے، پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ آج کل کے بیشتر ادیب اسی لکیر کے فقیر بننے کے شائق ہیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ کاغذ ضائع کیا جا سکے۔

پرانے زمانے کے شاعر بھی آج کل کے شاعروں کی طرح کاغذ کے استعمال کے بہت شوقین تھے، مگر کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے وہ حسب منشا کاغذ ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تلافی انھوں نے یوں کی کہ لفظ "کاغذ" کو اپنی شاعری میں بطور ردیف استعمال کرنا شروع کر دیا اور ایسی ایسی شکلیں زمینوں میں شاعری کی کہ مضحکہ خیزی میں آج کل کی نثری نظمیں ہی اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ استاد ذوق کی وہ غزل خاصی مشہور ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

مژدۂ قتل ہے اس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادیِ تن کا کاغذ

اس غزل کے مقطع میں انھوں نے بڑی نازک خیالی سے کام لیا ہے۔

ذوق دل سوختہ دیواں لکھے اپنا خاک
متحمل نہیں گرمیِ سخن کا کاغذ

کہتے ہیں کہ استاد ذوق کا دیوان گرمیِ سخن کی وجہ سے طاق پر رکھے رکھے جل گیا تھا، جسے بعد میں ان کے شاگرد رشید مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی یادداشت سے مرتب کیا تھا۔ آج کل کے بیشتر شاعروں کے دیوان طاق ہی پر رکھنے کے قابل ہیں، مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ کبھی نہیں جلیں گے، کیونکہ ان میں سخن کی وہ گرمی نہیں ہوتی جو کاغذ کو جلا دیتی ہے۔ ہاں وہ ٹھنڈک ضرور ہوتی ہے جس میں کرم کتابی کو نشوونما کا موقع ضرور ملتا ہے۔ بہرحال آگ لگے یا کیڑا، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

قلم برداشت ادب

ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی کتابیں عنایت فرماتے رہتے ہیں، بلکہ گاہ گاہ دوسروں کی تصانیف بھیج کر بھی ہماری ادبی و علمی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے علم کا ۹۵ فیصد حصہ ڈاکٹر صاحب ہی کی عطا کردہ کتابوں کا مرہونِ منت ہے، یہی وجہ ہے کہ باقی ۵ فیصد حصہ بھی ہمارے کسی کام نہیں آیا۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تصانیف خود نہیں پڑھتے، ورنہ آج وہ جس بلند مقام پر جلوہ گر ہیں، اس سے کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز نظر آتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف کردہ کتابیں شاید اسی وجہ سے نہیں پڑھتے جس وجہ سے ایک ہوٹل کا مالک اپنے ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتا تھا، ہمیشہ گھر سے منگواتا تھا۔ جب اس سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اس نے بتایا "اگر اپنے ہوٹل کا کھانا کھا کر مجھے کچھ ہو گیا تو گاہکوں کی خدمت کون کرے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ادبی ذوق کے لیے ایک دلچسپ کتاب عنایت کی ہے۔ اس کا نام ہے "دلچسپ ملاقاتیں" اور اس کے مرتب ہیں تنویر ظہور۔ اس میں چار درجن کے قریب ادیبوں کے انٹرویو ہیں۔ ان ادیبوں میں نصف تو وہ ہیں جن کے ادیب ہونے کی اطلاع اسی کتاب سے ملتی ہے اور یہ بیچارے بات کرنے سے بھی معذور نظر آتے ہیں۔ باقی نصف ہمارے عہد کے ممتاز اہلِ قلم ہیں جو بات کرنے اور بات بنانے ہی میں نہیں، باتیں بھگارنے کے فن میں بھی طاق ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے اچھا انٹرویو ڈاکٹر سلیم اختر کا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زیرِ نظر کتاب انھی کی عنایت سے ہمیں ملی ہے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا مناسب ترین طریقہ یہی ہے کہ ان کے انٹرویو کو سب سے اچھا قرار دیا جائے۔ انٹرویو کے اچھا ہونے کی دوسری وجہ بھی کوئی ضرور ہوگی جو اس وقت یاد نہیں آ رہی۔ اگر یاد آ گئی تو آگے چل کر عرض کر دیں گے، ورنہ ڈاکٹر

صاحب کو بذریعہ خط مطلع کر دیں گے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب سے ہمیں خط و کتابت کا شرف بھی حاصل ہے۔ ہمارے نام ان کے اتنے خط ہیں کہ اگر انھیں مرتب کر کے کتابی صورت میں چھپوا دیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کی تعداد اکاون ہو جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب باقی پچاس کتابوں سے زیادہ مقبول ہوگی کیونکہ یہ ایسی تحریروں پر مشتمل ہوگی جو قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ پطرس سے کسی نے پوچھا، اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے ہزار صفحات لکھے ہیں، لیکن مقبولیت صرف "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہوئی جب کہ یہ مختصر کتاب آپ کی جملہ تحریروں کے بیسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہے۔ پطرس نے جواب دیا، میں نے اپنی تمام تحریروں پر بڑی محنت کی ہے مگر "پطرس کے مضامین" میں وہ تحریریں شامل ہیں جو میں نے بغیر محنت کے قلم برداشتہ لکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے انٹرویو میں بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کبھی شاعری بھی کی ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں جوانی کے دنوں میں ان سے یہ غلطی ہوئی تھی لیکن "جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میری طبیعت کو شاعری سے مناسبت نہیں ہے، اس لیے شاعری ترک کر دی۔ کاش شعراء کی اکثریت کو میری مانند وقت پر احساس ہو جاتا تو آج نقادوں کی الجھنوں میں خاصی کمی ہو جاتی۔"

ڈاکٹر صاحب کے بجا فرمایا کہ ان کے شاعری ترک کر دینے سے نقادوں کی الجھنوں میں کمی ہو گئی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ اس فیصلے کے نتیجے میں نقادوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہو گیا۔ یہاں بھی ایک واقعہ بیان کیے بغیر بات واضح نہیں ہو سکتی۔ مشہور ناول نگار ایم اسلم ایک زمانے میں شاعری سے شوق فرماتے تھے۔ ایک دن وہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنا کلام سنایا اور شاعری کے سلسلے میں مشورے کے طالب ہوئے۔ علامہ نے فرمایا کہ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ شاعری ترک کر دیں کیونکہ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے بعد ایم اسلم نے ناول لکھنے شروع کر دیے۔ ایک روز انھوں نے دوستوں کی محفل میں بڑے فخر سے کہا "میں نے علامہ کے مشورے پر شاعری ترک کی تھی۔" اس پر ایک دوست نے ان لفظوں میں داد دی "کاش نثر نگاری کے سلسلے میں بھی آپ ان سے مشورہ کر لیتے۔"

اس واقعے کے بیان کرنے کے بعد یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو شاعری

WWW.KITABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ترک کرنے کا خیال وقت پر آیا لیکن کسی قسم کا کوئی دوسرا خیال، اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی نہیں آیا۔ اچھا ہی ہوا ورنہ اردو ادب پچاس بہترین کتابوں سے محروم رہ جاتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا ہے، ''میں بچپن میں نہایت شرارتی لڑکا تھا۔ جب کالج پہنچا تو ایک لاابالی نوجوان بن چکا تھا..... اس زمانے میں مجھے پڑھائی سے خاصی دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول میں میری شرارتیں رنگ لاتی رہتیں اور وقتاً فوقتاً ان شرارتوں کی بنا پر سزا پاتا رہتا۔''

ڈاکٹر صاحب کو بچپن میں پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بچپن ہی سے ان میں نقاد بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔

شرارتی تو خیر ڈاکٹر صاحب اب بھی ہیں جس کا اندازہ انٹرویو سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

دبستانِ سرگودھا کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں وہ فرماتے ہیں، ''سرگودھا اسکول کی خدمات یقیناً ہیں لیکن وہ ادب کے لیے نہیں بلکہ اس اسکول کے طالب علموں کے لیے۔'' واضح رہے کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب خود سرگودھا اسکول سے منسلک تھے۔ اب وہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں، تاہم انھیں وہ خدمات یاد ہیں جو اسکول نے اپنے طالب علموں کے لیے انجام دیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے انٹرویو کے بعد دوسرا اہم انٹرویو ممتاز شاعر قتیل شفائی کا ہے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز تجارت سے ہوا۔ پہلے انھوں نے کھیلوں کے سامان کی دکان کھولی لیکن مال نایاب نہ ہونے کے باوجود گاہک بے خبر رہے۔ پھر کپڑے کی دکان میں طالع آزمائی لیکن مندی کا رجحان ایسا تھا کہ کسی عاشق نے بھی گریبان کا چار گرہ کپڑا خریدنے کی زحمت نہ کی۔ مجبوراً اس دکان کو بھی بڑھانا پڑا۔ اس کے بعد ایک عزیز کو منافع کی توقع پر کچھ رقم دی۔ منافع تو کیا ملتا، اصل رقم بھی ڈوب گئی۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے شاعری شروع کر دی۔ خدا نے اس کاروبار میں اتنی ترقی دی کہ آج قتیل صاحب کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کپڑے کی دکان چل نکلتی تو آج قتیل شفائی بہت بڑے تاجر ہوتے لیکن اُردو ادب ایک طرح دار شاعر سے محروم رہ جاتا۔

مرتب کتاب نے جناب قتیل شفائی سے بعض گستاخانہ قسم کے سوال بھی کیے ہیں جو کم از کم

ہمیں پسند نہیں آئے۔ قتیل شفائی صاحب کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے بڑے تحمل سے یہ سوالات سنے اور نہایت تحمل سے ان کے جوابات دیے۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ تو ترقی پسند ہیں، پھر آپ نے ضیاء الحق کو اپنی کتابیں کیوں بھیجیں۔ قتیل صاحب کا جواب یہ تھا، ''مجھ پر لعنت اگر میں نے ضیاء الحق کو کتاب بھیجی ہو۔ ایک مرتبہ ضیاء الحق نے غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہلِ قلم کانفرنس میں ضیاء الحق نے مجھے دیکھ کر کہا، قتیل صاحب آپ کی کتابیں مجھے مل گئی ہیں۔ میں نے ان کی رسید آپ کو بھیج دی ہے۔ اب میں کیا کہتا۔ سب میں جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔''

ضیاء الحق کی زندگی میں نہ سہی، اب سہی، قتیل صاحب نے بہر حال مرحوم کو جھٹلا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے، لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جو اہلِ قلم کانفرنس ضیاء الحق کے ایما پر منعقد ہوئی تھی، اس میں قتیل صاحب جیسے مستند ترقی پسند نے شرکت کیوں کی۔ یہ مسئلہ جب ہم نے استاد الاطرمراد آبادی کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا، ''غیر ترقی پسندوں کی اہلِ قلم کانفرنس کے مقاصد سے قتیل صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو وہاں اپنی کتابوں کی رسید لینے گئے تھے۔''

ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ گزشتہ دورِ حکومت میں کیا آپ کو بھی پلاٹ ملا تھا۔ قتیل صاحب نے فرمایا، ''سب کو ملے ہیں جی۔ میں نے ایک لیا جو میرا حق تھا۔ اوروں نے تو دو دو تین تین حاصل کیے اور کئی دوسری ناجائز مراعات بھی۔''

لاہور کے ادیب خوش قسمت ہیں کہ ہر حکومت انھیں پلاٹ دیتی ہے۔ کراچی والوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ زمین کا پلاٹ تو کیا، حکومت نے کراچی کے کسی ادیب کو ناول یا افسانے کا پلاٹ بھی نہیں دیا۔

اُردو ادب کے مشہور دبستان جن کے سربراہ جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا ہیں، اس کتاب کا خاص الخاص موضوع ہیں۔ کتاب کے مرتب نے تقریباً ہر ادیب سے ان دبستانوں کے بارے میں سوال کیا ہے۔ بعض نے بہت دلچسپ جواب دیے ہیں لیکن انھیں ہم نقل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں کسی ایک دبستان کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے۔ ہماری طرح دونوں کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اس کتاب سے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ جھگڑے کا آغاز کس طرح ہوا۔ قاسمی صاحب اور آغا صاحب نے اپنے اپنے بیانات میں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد وجوہ بیان کی ہیں۔ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، کیوں کہ ہمارے لیے دونوں ہی قابل احترام ہیں، اور احترام کا تقاضا ہے کہ دونوں کو صحیح سمجھا جائے۔

ادبی لے پالک

بعض لوگ محض اس لیے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کا نام کسی بڑے ادیب کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ جیسے میرن صاحب، جو بذاتِ خود کچھ نہیں تھے مگر غالب سے تعلق کی وجہ سے اتنی شہرت پا گئے کہ ہر غالب شناس ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہی معاملہ علی بخش کا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے ذاتی ملازم تھے۔ گھر کا سودا سلف لاتے تھے، حقہ تازہ کرتے تھے، جاوید اقبال کو کھیل کود میں مصروف رکھتے تھے کہ کہیں یہ بچہ علامہ کے کمرے میں جا کر ان کے فکری انہماک میں خلل انداز نہ ہو۔ کسے خبر تھی کہ یہی علی بخش ماہرین اقبالیات کی دلچسپی کا مستقل موضوع بن جائیں گے۔ اور کیا تعجب کے کسی دن یہ خبر بھی سننے میں آجائے کہ ڈاکٹر یونس حسنی، صدر شعبۂ اُردو کراچی یونیورسٹی کی نگرانی میں علی بخش کی حیات اور کارناموں پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی تحقیقی ناکارکردگی کا ازالہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔

بڑے ادیبوں کے خطوط بھی گمناموں کو نامور بنانے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے خطوط ایسے کئی لوگوں کے نام موجود ہیں جن کے بارے میں اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سوائے اس کے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا کہ غالب اور اقبال سے اپنے نام خط لکھوا لیے۔ جب تک غالب اور اقبال کے نام باقی ہیں ان کے مکتوب الیہان کے نام بھی روشن رہیں گے۔

کسی بڑے ادیب کا مکتوب الیہ ہونا بڑے فخر کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض من چلوں نے مشاہیر کی طرف سے اپنے نام خود ہی خط لکھ کر چھپوا لیے۔ اس سلسلے میں عباس علی خان لمعہ نامی

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ایک شاعر خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے نام اقبال کے کئی جعلی خط شائع ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں، بڑے ادیب کے کسی مکتوب الیہ کی اولاد میں سے ہونا بھی باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں گیا (بہار) کے ایک شاعر رسا ہمدانی نے ''نادر خطوط غالب'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں ان کے دادا کے نام غالب کے خط تھے۔ یہ سارے خط جعلی تھے۔ خیریت گزری کہ دادا اصلی تھے، ان کو جعل سازی سے دادا نہیں بنایا گیا تھا۔

کسی بڑے ادیب کا مکتوب الیہ بن کر شہرت حاصل کرنے کی تازہ ترین مثال محمد رضا کاظمی کی ہے، جن کے نام پروفیسر آل احمد سرور کا ایک خط کراچی کے ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، اور اسی خط پر مزید بحث کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔ لیکن پہلے محمد رضا کاظمی کا تعارف کرا دیا جائے تو بہتر ہوگا، تاکہ ان کی شہرت کے اسباب میں ایک بڑے ادیب کے خط کے ساتھ ایک معمولی لکھنے والے کی تحریر کو بھی شامل کیا جا سکے۔

محمد رضا کاظمی کراچی کے ایک کالج میں استاد ہیں اور اس شہر کی مجلسی زندگی میں اس حد تک دخیل ہیں کہ کوئی ادبی تقریب اور کوئی مجلس عزا ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ شاعری اور تنقید سے انھیں بے حد دلچسپی ہے۔ شاعری میں ان کا معیار بہت اونچا ہے، اس لیے شعر نہیں کہتے، تنقید لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ دوسروں کا تنقیدی معیار اونچا ہو سکے۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''جدید اردو مرثیہ'' تھی جو مرثیوں کی طرح پڑھنے کی نہیں، سننے کی چیز ہے کیونکہ اس میں مرثیوں کے اقتباسات نثر سے زیادہ ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فیض احمد فیض کو ایک جدید مرثیہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں فیض نے ایک ''دوست'' کی فرمائش پر گیارہ بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ امام لکھا تھا جس کی کوئی ادبی اہمیت نہیں۔ یہ مرثیہ فیض کی پنجابی کی طرح ہر اعتبار سے ناقابل اعتنا ہے۔ اس کے باوجود محمد رضا کاظمی نے طویل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ مرثیہ فیض کی ادبی زندگی کے ایک اہم موڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔

محمد رضا کاظمی نے پچھلے پندرہ برسوں میں متعدد تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ حال ہی میں یہ مضامین ''تاب سخن'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ کتاب کے نام سے دھوکا کھا جائیں اور اسے شعری مجموعہ سمجھ کر نہ خریدیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو لوگ اسے تنقیدی مجموعہ سمجھ کر خریدیں گے وہ بھی دھوکا ہی کھائیں گے، کیونکہ کتاب کے

بیشتر مضامین میں تنقید کے نام پر شاعری ہی کی گئی ہے۔ لیکن وہ مضامین جو اختر حسین رائے پوری، کلیم الدین احمد اور پروفیسر ممتاز حسین کے بارے میں ہیں، بلاشبہ نہایت عمدہ تنقیدی مطالعے ہیں، اور ان سے یہ امید بندھتی ہے کہ اگر محمد رضا کاظمی اس قسم کے مضامین لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوگا۔ ہم نے آج ہی سے اس دن کے انتظار میں دن گننا شروع کر دیے ہیں۔

''تاب سخن'' کے بارے میں تفصیلی بحث تو پھر کبھی ہوگی، فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایک اہم کتاب ہے کیونکہ اسی کے ذریعے آل احمد سرور کا وہ خط منظر عام پر آیا ہے جس کا کراچی کے ادبی حلقوں میں آج کل بڑا چرچا ہے۔ یہ خط ڈاکٹر محمد حسن کی شان میں قصیدے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر صاحب نے کراچی کے رسالے میں سرور صاحب کے بارے میں ایک نہایت عجیب و غریب مضمون لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سرور صاحب پر رشید احمد کے بے شمار احسانات تھے۔ وہ رشید صاحب کے شاگرد ہی نہیں ''لے پالک'' بھی تھے۔ انھیں یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں دلوائیں اور پھر انھیں حالی و شبلی کا ہم مرتبہ قرار دیا۔ مختصر یہ کہ بقول ڈاکٹر محمد حسن، ''سرور صاحب نے رشید صاحب کے اسلوب اور شخصیت سے جو کچھ حاصل کیا، وہ ان کی فطری صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ سرور صاحب سے اسلوب چھین لیجیے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتے۔ یہ اسلوب بڑی حد تک رشید صاحب کی دین ہے۔'' لیکن سرور صاحب نے رشید صاحب کے ان احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا کہ رشید صاحب کی ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی ملازمت میں توسیع کی مخالفت کی اور خود ان کی جگہ صدر شعبہ ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی دیگر دلچسپ باتوں سے قطع نظر یہ بات بڑی مزے کی ہے کہ اگر سرور صاحب سے اسلوب چھین لیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتے۔ شاید موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ اسلوب جیب میں رکھے ہوئے بٹوے جیسی کوئی چیز ہے۔ اگر یہ درست ہے تو تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ آنکھ بچا کر یہ بٹوا سرور صاحب کی جیب سے نکال لینا چاہیے۔ رشید صاحب کی یادگار ڈاکٹر محمد حسن کو اپنے پاس رکھنی چاہیے کہ اس وقت وہی رشید صاحب کے سب سے بڑے طرف دار اور ہمدرد ہیں۔

سرور صاحب اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی اداروں سے بھی کسی نہ کسی طرح

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کا تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ان خدمات کو بھی اپنی مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"سرور صاحب کی اس دور کی زندگی ان کے ماضی سے اتنی مختلف تھی کہ ان کے پرانے جاننے والے ان کے اس کردار کو پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ دراصل ان کے ہاں ایک عجیب خلش تھی۔ باقاعدہ پروفیسر اور صدر شعبہ نہ ہونے کی خلش..... یہ خلش انھیں بہت ستاتی تھی اور اسی خلش کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف اور زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا۔ ملک کی سب سے بڑی ادبی جماعت ساہیہ اکیڈیمی کی اُردو کمیٹی کے کنوینر بنے، انجمن ترقی اُردو ہند..... کے سیکرٹری بنے۔ یونیورسٹی میں سرسید ہال کے پروسٹ بنے۔ ایک زمانے میں یونیورسٹی لائبریری کے آنریری لائبریرین بھی مقرر ہوئے۔"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن کے نزدیک علمی و ادبی کاموں میں سرور صاحب کا اپنے آپ کو زیادہ مصروف رکھنا محض اس لیے تھا کہ وہ پروفیسر اور صدر شعبہ نہ ہونے کی خلش کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ گویا جو بات ڈاکٹر محمد حسن نے تحقیراً لکھی ہے، اسی سے سرور صاحب کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ سرور صاحب چونکہ علمی و ادبی مذاق رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے مذاق سے مطابقت رکھنے والے اداروں سے تعلق پیدا کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے مذاق اور اہلیت کے برعکس کوئی مصروفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اگر وہ میر و سودا سے پہلے کی زبان کو نہ سمجھنے کے باوجود "دیوان آبرو" مرتب کرتے یا ہندی ادب کا مطالعہ نہ ہونے کے باوجود ہندی ادب کی تاریخ لکھ دیتے تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ سرور صاحب نے اپنی خلش مٹانے کے لیے غلط کام کیے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون میں سرور صاحب کے خلاف بلا سبب زہر اگلا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ سب کچھ بلا سبب نہیں ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے ایک مضمون سے سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سرور صاحب کے بارے میں جو کتاب مرتب کی ہے، اس میں ڈاکٹر نقوی کا یہ مضمون شامل ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ لیکچرار کی ایک جگہ کے لیے رضیہ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد حسن امیدوار تھے۔ سجاد ظہیر نے سرور صاحب کو کئی خط لکھے کہ وہ رضیہ کی سفارش کر دیں لیکن سرور صاحب نے ان خطوں کا اثر نہ لیا اور ڈاکٹر محمد حسن کی سفارش کر دی کیونکہ

ان کے نزدیک وہ اس جگہ کے لیے رضیہ سجاد ظہیر سے زیادہ اہل تھے۔ سرور صاحب کی اسی اصول پسندی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر محمد حسن نے مذکورہ مضمون لکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون کا جواب محمد رضا کاظمی نے لکھا جو کسی وجہ سے متعلقہ رسالے میں شائع نہ ہو سکا۔ کاظمی صاحب نے اپنا مضمون سرور صاحب کو بھیج دیا۔ موصوف نے اس کی رسید میں جو خط لکھا، وہ اور کاظمی صاحب کا مضمون، دونوں "تاب سخن" میں شامل ہیں۔

سرور صاحب خط کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"مجھے (ڈاکٹر محمد حسن کا) مضمون دروغ کی پوٹ معلوم ہوا۔ مضمون نگار کا..... خبث باطن بھی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جواب کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب خیال ہوتا ہے کہ جواب دے ہی دینا چاہیے تھا۔ ایڈیٹر کو اس قسم کا مضمون چھاپنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں سبک دوش ہوئے۔ آخر ۳۳ برس بعد اس مسئلے کو کریدنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔"

سرور صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اس پر اعتراض کرنے کی ہم جسارت نہیں کرتے، تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "خبث باطن" کی ترکیب درست نہیں ہے۔ جو چیز ظاہر ہو گئی، اسے باطن سے منسلک کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔ رسالے کے ایڈیٹر کے متعلق سرور صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی درست نہیں۔ کسی بھی اُردو رسالے کے ایڈیٹر کے فرائض میں یہ شامل نہیں ہے کہ مضامین کی اشاعت سے پہلے تو کیا، بعد میں بھی سوچا جائے۔ اور یہاں تو مضمون نگار نے بھی لکھنے سے پہلے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی، بے چارہ ایڈیٹر کیوں اپنی عاقبت خراب کرتا۔

سرور صاحب نے تمام جھوٹے الزامات کو مدلل انداز میں رد کیا ہے۔ یہ خط خاصا طویل ہے، افسوس کہ اس مختصر کالم میں اسے نقل نہیں کیا جا سکتا۔ پورے خط کو نقل کرنا اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ اسی کی وجہ سے محمد رضا کاظمی کی کتاب مقبول ہو رہی ہے۔ اگر یہ خط یہاں نقل کر دیا گیا تو کتاب کون خریدے گا۔ تاہم رشید احمد صدیقی کے ایک خط کا اقتباس، جو سرور صاحب نے اپنے خط میں درج کیا ہے، تبرکاً نقل کیا جاتا ہے کہ یہ انشائے رشید کا نادر نمونہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن سے پہلے بھی بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی رہی ہے کہ رشید صاحب اور سرور صاحب میں استادی شاگردی کا تعلق ہے۔ رشید صاحب نے بڑی عمدگی سے اس "افواہ" کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

"آج کل ادھر ادھر یہ غلط خبر ذرا زیادہ پھیلنے لگ گئی ہے کہ آپ میرے شاگرد ہیں اور لطف یہ ہے کہ جب آپ کو برا بننا ہوتا ہے تو میری شاگردی کا واسطہ دیتے ہیں اور جب آپ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں۔ اپنی بے غیرتی کو کیا کہوں کہ چپکا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے۔ چپکا میں ج کو زیر بھی دے سکتے ہیں۔"

نقاد یا بندۂ تخمین و ظن

دو تین سال بعد رسالہ "نقوش" کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے، گویا اس رسالے کی عمر اس کے موجودہ ایڈیٹر کی عمر سے زیادہ ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے جب اس رسالے کو جاری کیا تھا تو کسے معلوم تھا کہ اس کا ہر شمارہ اُردو ادب کی تاریخ کا سنگ میل ثابت ہوگا۔ "نقوش" نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ بڑے بڑے اداروں کی خدمات سے زیادہ ہے۔ محمد طفیل کے انتقال کے بعد امید نہیں تھی کہ یہ رسالہ جاری رہے گا، مگر مرحوم کے صاحبزادے، جاوید طفیل، نے نہ صرف اسے جاری رکھا بلکہ یہ احساس بھی نہ ہونے دیا کہ محمد طفیل کا انتقال ہو چکا ہے، کیونکہ رسالہ اسی شان سے نکل رہا ہے جس طرح محمد طفیل کی زندگی میں نکلتا تھا۔ بس یہ فرق ہے کہ اب ہر شمارہ کتابت کی تاریخ کا سنگ میل بھی ہوتا ہے۔ تازہ شمارہ، جو اسی مہینے شائع ہوا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ہر صفحے پر کتابت کی کم از کم ایک درجن غلطیاں نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی صفحہ غلطیوں سے پاک ہے تو اسے حسن اتفاق سمجھنا چاہیے، ایڈیٹر کی کوتاہی کا نتیجہ قرار نہیں دینا چاہیے۔ "نقوش" اگر کوئی عام رسالہ ہوتا تو کتابت کی غلطیاں نظر نہ آتیں، لیکن جو رسالہ شروع سے آخر تک پڑھا جاتا ہو، اس میں اتنی غلطیوں کا ہونا حیرت ناک ہے۔ اگر محمد طفیل زندہ ہوتے تو وہ اس شمارے کے تمام نسخوں کو ایک جگہ ڈھیر کر کے آگ لگا دیتے اور پھر اسے دوبارہ چھاپتے۔ جاوید طفیل ایسا نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ اس کا امکان ہے کہ رسالہ دوبارہ چھپ کر آئے تو اس میں کتابت کی غلطیاں پہلے سے زیادہ ہوں۔

لیکن "نقوش" کے تازہ شمارے میں صرف کتابت کی غلطیاں ہی نہیں ہیں، اور بہت کچھ بھی ہے۔ اتنا کچھ کہ اس کا ذکر کرنے کے لیے کئی کالم درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ بہت سے کالم

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

لکھتے ہمارے لیے اور ان کا پڑھنا قارئین کے لیے ممکن نہیں، اس لیے ہم رسالے کے خاص خاص مندرجات کا ہی ذکر کریں گے۔

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ نقاد اور محقق تخلیقی فنکار نہیں ہو سکتے۔ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور کلیم الدین احمد بلند مرتبہ نقاد ہیں، لیکن ان کی شاعری دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری کے نام پر گھاس کاٹی جا رہی ہو۔ ڈاکٹر سلیم اختر مستثنیات میں سے ہیں۔ وہ جتنے اچھے نقاد ہیں، اتنے ہی اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ "جتنے" اور "اتنے" کے وزن کا ایک لفظ "کتنے" بھی ہے، ہم اسے بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں، یعنی یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ کتنے اچھے نقاد اور کتنے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن یہ کام ہمارا نہیں، ڈاکٹر انور سدید کا ہے کہ وہ ہم سے بہتر بندۂ تحسین وطن ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے پسندیدہ مصنفین میں سے ہیں اور جب بھی کسی رسالے میں ان کی کوئی تحریر شائع ہوتی ہے تو سب سے پہلے ہم اسی کو پڑھتے ہیں۔ "نقوش" کے مطالعے کا آغاز بھی ہم نے ان کے سفرنامے سے کیا ہے۔

پچھلے سال ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کا سفر کیا، جتنا وقت انھوں نے سفر پر صرف کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ وہ اب سفرنامے پر صرف کر رہے ہیں، یعنی بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک منفرد سفرنامہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ سفرنامے کا جو حصہ "نقوش" میں شائع ہوا ہے، اس میں لاس اینجلس کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے امریکی زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کیا ہے، یہاں تک کہ وہ قمار خانوں میں بھی گئے ہیں مگر بقول خود، اس شخص کی طرح جو بازار سے گزرا ہو مگر خریدار نہ ہو۔ اُردو کے عام سفرنامہ نگاروں کی طرح انھوں نے خاص خاص مناظر کے ذکر میں آرائش بیان سے کام نہیں لیا بلکہ خاصے بخل کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک ہوٹل کے سوئمنگ پول پر انھوں نے دیکھا کہ "جل پریاں جل کو جوالا میں تبدیل کر رہی ہیں۔" یہ بتانے کے بعد انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی، "میں اس منظر کی بارک جزئیات کو سنسر کر رہا ہوں۔" اب اس بھلے مانس سیاح سے یہ کون پوچھے کہ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو سفرنامہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے سفرنامہ نگار تو خالی سوئمنگ پول میں جل پریاں اپنی گرد سے ڈال کر منظر نگاری کا حق ادا کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر سلیم اختر ہاتھ آئی دولت سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے وہ

اپنے سفرنامے کو "بارہ مسالوں کی چاٹ کے برعکس مونگ کی ابلی دال جیسا سفرنامہ" کہتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے، انھوں نے مونگ کی دال خاصے سلیقے سے ابالی ہے، اس لیے نہایت مزے کی ہے۔

اس سفرنامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جا بجا ایسے جملے نظر آتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے امریکہ کے سفر کا ہی نہیں، زندگی کے سفر کا بھی حاصل ہیں۔ مثلاً شروع میں یہ جملہ ملتا ہے، "بالآخر غیر ادیب ہی پر خلوص دوست ثابت ہوتے ہیں۔" زندگی بھر ادبی دوستیاں نبھانے یعنی دوستوں پر اور ان کی کتابوں پر تعریفی مضامین لکھتے رہنے کا یہ انجام خاصا عبرتناک ہے!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے غالب کے تین نئے خط ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ان خطوں کو نیا اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن غالب کے عاشق ہیں، ان جیسے جوان رعنا کا غالب جیسے پیر فرتوت پر عاشق ہونا اگرچہ عجیب سی بات ہے مگر عشق تو اندھا ہوتا ہے، اس لیے وہ جوانی و پیری کے فرق کو نہیں دیکھتا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا عشق، غالب کے دوسرے عاشقوں کی طرح غالب کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔ وہ جب بھی غالب کے حوالے سے کوئی کام کرتے ہیں، اس کی کوئی نہ کوئی افادیت ضرور ہوتی ہے۔ غالب کے تین خطوں کا پہلی بار شائع ہونا ایک اہم واقعہ تو ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ خط غالب کے اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔

غالب کے غیر مطبوعہ خطوط آئے دن منظر عام پر آتے رہتے ہیں، چند مہینے پہلے بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر حنیف نقوی نے چار فارسی خط دریافت کیے تھے، اس سے کچھ پہلے پانچ نئے خط آفاق دہلوی نے بھی شائع کیے تھے، ایک خط اکبر علی عرشی زادہ کو بھی مل گیا تھا۔ ہمیں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی غالب خط و کتابت سے باز نہیں آئے، وہاں بھی ان کے ادبی مشاغل جاری ہیں۔ کیا تعجب کہ کسی دن ان کا ایک اور غیر مطبوعہ دیوان بھی دستیاب ہو جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح علامہ اقبال نے وفات کے بعد ایک فارسی مثنوی لکھی تھی، اس مثنوی کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن علامہ اقبال کو نہ جانے کیا سوجھی کہ رفیق خاور مرحوم کے خواب میں آ گئے اور ان سے کہا کہ اب فارسی جاننے والے ایک تمھیں رہ گئے ہو، کاغذ قلم سنبھالو اور میں جو بولتا جاؤں لکھتے جاؤ، علامہ نے ایک پوری مثنوی رات بھر میں لکھوا دی۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

صبح جب رفیق خاور بیدار ہوئے تو مثنوی کا مسوّدہ ان کے سرہانے رکھا تھا۔ اس مثنوی کو انھوں نے "حرف نشاط آور" کے نام سے چھپوا دیا۔ ادبی حلقوں میں اسے الہامی تصنیف قرار دیا گیا۔ رفیق خاور خوش تھے کہ اگر وہ اس مثنوی کو اپنے نام سے چھپواتے تو کوئی توجہ نہ کرتا، مگر علامہ اقبال سے منسوب ہونے کی وجہ سے مثنوی کے سارے نسخے بک گئے۔

غالب کا ذکر چلا ہے تو اس خبر کا بھی ذکر کر دینا چاہیے، جو غالب کی گرفتاری سے متعلق ہے۔ ہندوستانی محقق گربچن چندن نے "نقوش" میں مولوی محمد باقر کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا ہے۔ مولوی صاحب اُردو کے پہلے باقاعدہ صحافی تھے، وہ "دہلی اُردو اخبار" کے ایڈیٹر اور مولوی محمد حسین آزاد کے دادا تھے۔ گربچن چندن نے بتایا کہ "دہلی اُردو اخبار" میں بھی آج کل کے اخباروں کی طرح ادبی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے اخبار سے ایک دلچسپ خبر نقل کی ہے، اس کا کچھ حصہ یہ ہے:

"تھانہ گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے..... کہتے ہیں کہ بڑا قمار ہوتا تھا، لیکن بہ سبب رعب اور کثرت مرداں کے یاں کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا، اب تھوڑے دن ہوئے ایک تھانیدار، قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ بہت بے طمع ہے، یہ مرزا نوشہ شاعر نامی ہے۔ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی اور سفارش بھی آئی، لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا، سب کو گرفتار کیا، عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا، مرزا نوشہ پر ایک سو روپے نہ ادا کریں تو چار مہینے قید۔"

ہمیں اس پر تعجب نہیں کہ غالب جوا کھیلنے یا کھلانے کے جرم میں پکڑے گئے، تعجب اس پر ہے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے پولیس والے بے طمع ہوتے تھے۔ اس خبر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے اخباروں کی طرح ڈیڑھ سو سال پہلے کے اخباروں میں بھی خبروں کی پیشکش میں جانبداری کا رجحان پایا جاتا تھا۔ مولوی محمد باقر چونکہ غالب کے مقابلے پر ذوق کے طرف دار تھے اس لیے انھوں نے خبر کو اس طرح مرتب کیا کہ اس کے بین السطور سے غالب کی گرفتاری پر دلی مسرّت کا اظہار ہوتا ہے۔

آغا بابر مشہور افسانہ نگار ہیں، اب وہ کچھ عرصے سے اپنے حالات و مشاہدات قلم بند کر رہے ہیں۔ اس آپ بیتی کا ایک حصہ "نقوش" میں بھی شامل ہے۔ اس میں آپ بیتی کم اور

دوسروں کا کچا چٹھا زیادہ ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے بارے میں انھوں نے دلچسپ انکشافات کیے ہیں۔ مثلاً بظاہر صوفی تھے مگر بباطن اس کے برعکس تھے۔ یہ بھی لکھا ہے، "میرے علم میں شہاب صاحب کے ایسے ایسے رومانٹک قصے موجود ہیں جن میں ہندو دیویاں، سکھ سردارنیاں اور مسلمان گوپیاں شامل ہیں۔" یہ بھی بتایا ہے کہ پطرس اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی سے شہاب حسد کرتے تھے، مگر یہ نہیں بتایا کہ حسد کی وجہ کیا تھی۔ شہاب پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ انھوں نے گورِ غریباں میں دفن ہونے کی بجائے سول سروس کے افسروں کے درمیان دفن ہونا پسند کیا۔ شہاب کے بارے میں لکھتے ہوئے آغا بابر وقائع نگار سے زیادہ افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ اگر آغا بابر کے سارے الزامات درست مان لیے جائیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شہاب زندگی میں اگر حاسد تھے تو مرنے کے بعد محسود ہو گئے۔ ان کی بخشش کے لیے یہی کافی ہے۔

"نقوش" میں سو سے زیادہ صفحے نظموں، غزلوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ساری نظمیں اور غزلیں کسی ایک ہی شاعر نے لکھی ہیں۔ شاعر بھی ایسا جس کا ذخیرہ الفاظ چند لفظوں تک محدود ہے۔ شاید ہی کوئی نظم یا غزل ہو گی جس میں خواب، لہو، شاخ، شرر، دھواں، آئینہ، خوشبو، پیاس اور سمندر وغیرہ الفاظ استعمال نہ کیے گئے ہوں۔ کثرت استعمال سے یہ لفظ ہی نہیں ان کے معنی بھی گھس گئے ہیں۔ کہیں کہیں کسی شاعر نے اپنی دانست میں کوئی نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے، مگر اس میں بھی "نیا پن" ہی ملتا ہے، بات کوئی نظر نہیں آئی۔ مثلاً ایک شعر ہے:

ممتاز محل ڈوب گئی آب رواں میں
ہم تاج محل پانی میں تعمیر کریں گے

ہم بہت دیر تک سوچتے رہے کہ آخر شاعر نے کیا بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ جب مسئلہ حل نہ ہوا تو استاد لاغر مراد آبادی سے مدد کی درخواست کی، انھوں نے فرمایا، "پانی میں تاج محل تعمیر کرنا کونسا مشکل کام ہے، آج کل ایسے بڑے بڑے جہاز بنائے گئے ہیں جن میں پورے پورے شہر آباد ہوتے ہیں۔ ایسے یہ کسی جہاز میں تاج محل تعمیر کر لیا جائے گا، ممتاز محل کی لاش آب رواں کے ساتھ جہاں جہاں جائے گی، تاج محل والا جہاز بھی اس کے اوپر تیرتا رہے گا۔" ہم نے عرض کیا: "اصل مسئلہ یہ نہیں کہ پانی میں تاج محل کس طرح تعمیر کیا جائے گا، سوال یہ ہے کہ ممتاز محل

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

آب رواں میں کیوں ڈوبی اور وہ بھی وفات کے ساڑھے تین سو سال بعد۔" استاد نے فرمایا، "شاعر استعاروں میں بات کرتے ہیں، ممتاز محل سے مراد آج کل کی شاعری ہے۔ اب آپ شعر کو پڑھیے تو یہ خاصا بامعنی نظر آئے گا۔"

شعر کی طرح، استاد گرامی کی تشریح بھی ہماری سمجھ سے بالا تھی۔

تخلیقِ ادب اور اعصابی تناؤ

بعض غلط کام ایسی شبھ گھڑی یا ساعت سعید میں انجام پاتے ہیں کہ ان کے غلط ہونے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا بلکہ ان غلط کاموں کو صحیح سمجھ کر ان کی تقلید کی جاتی ہے۔ اُردو میں ادیبوں کے انٹرویوز کی پہلی کتاب ۳۳۔۳۴ برس پہلے "ملاقاتیں" کے نام سے ندا فاضلی نے شائع کی تھی۔ ان کے دیگر غلط کاموں یعنی شاعری وغیرہ کی تو کچھ زیادہ داد نہیں ملی لیکن انٹرویوز کی کتاب خاصی سبز قدم ثابت ہوئی۔ اس کی اشاعت کے بعد یاروں نے اس قسم کی کتابیں شائع کرنے پر کمر باندھ لی۔ حالانکہ انٹرویو لینے والوں کے پاس اُردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح کمر ہوتی ہی نہیں بلکہ ذہن بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود تو کوئی بات کر نہیں پاتے گفتگو کا سارا بوجھ انٹرویو دینے والے ہی کو اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس بات کو گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ ذہن کی دال پر نقطہ لگانے سے جو لفظ غلط بنتا ہے وہ بھی معدوم ہوتا ہے کیونکہ سوال کرنے کے لیے پڑھنے کی اور پھر سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے انٹرویو لینے والے ان دونوں کاموں سے اسی طرح اجتناب کرتے ہیں جس طرح ذیابیطس کے مریض شکر سے پرہیز کرتے ہیں۔

ہم نے ایسے انٹرویو لینے والے بھی دیکھے ہیں جو فیض جیسی بڑی ادبی شخصیت سے ادبی مسائل پر گفتگو کی بجائے اس قسم کے سوال کر کے انٹرویو مرتب کرتے تھے کہ آپ کا پسندیدہ رنگ کونسا ہے، آپ چائے میں کتنی شکر ڈالتے ہیں، آپ کس نمبر کے موزے استعمال کرتے ہیں۔ گویا اچھے خاصے آدمی کو فلم ایکٹر بنا دینا ان انٹرویو لینے والوں کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ خدا بھلا کرے طاہر مسعود کا، انھوں نے انٹرویوز کو فلمی اثرات سے پاک کیا اور ادبی مکالمے کی بنیاد رکھی۔ طاہر مسعود جس ادیب سے انٹرویو کرتے تھے، پہلے اس کی تحریروں کو بغور پڑھتے تھے اور پھر ایسے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ایسے سوال کرتے تھے کہ جواب دینے والا پریشان ہو جاتا تھا۔ طاہر مسعود کے انٹرویوز کا مجموعہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جو پاکستان اور ہندوستان، دونوں جگہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ اب بازار میں یہ دستیاب ہے نہ اس کا مصنف۔ سنا ہے طاہر مسعود ادب کو خیر باد کہہ کر تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ تحقیق کے ذریعے مردے خراب کیے جاتے ہیں اب معلوم ہوا کہ جیتے جاگتے لوگ بھی از کار رفتہ ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ سطریں طاہر مسعود کی نظر سے گزریں تو ان سے گزارش ہے کہ ادب کی دنیا میں واپس آ جائیں۔ نہ صرف یہ کہ انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ بھی نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ صرف ایک کتاب لکھ کر اس درجہ نادم کیوں ہوئے کہ ادبی منظر ہی سے غائب ہو گئے، حالانکہ اب تو وہ لوگ بھی نادم نہیں ہوتے جو ایک سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انٹرویو لینے والے نئے نئے تجربے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے ٹیلی فون پر انٹرویو لینے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو اس قسم سوال و جواب پر مشتمل ہوتا تھا۔ میں کون؟ عامل۔ تم کون؟ معمول۔ جو پوچھے گا بتائے گا؟ بتائے گا۔ یہ انٹرویو خاصے مقبول ہوئے تھے۔ اب ایک صاحب نے بذریعہ خط و کتابت یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ وہ اپنے ''معمول'' کو سوال نامہ بھیج دیتے ہیں اور تحریر جواب حاصل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے اس قسم کے انٹرویو کا ایک مجموعہ حال ہی میں ''پس تحریر'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان صاحب کا نام ہے منور علی ملک۔ فلیپ کی تعارفی عبارت کے مطابق وہ خاصے مشہور آدمی ہیں۔ انگریزی اخبارات و رسائل میں سیاسی کالم اور ادبی تبصرے لکھتے ہیں، اُردو میں بہت خوبصورت شاعری ہی نہیں کرتے بلکہ ''تمام اصناف ادب میں دھرتی پر پیر جما کر بڑا ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں۔

ہمیں اس اطلاع سے بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں کم از کم ایک ادیب تو ایسا موجود ہے جو دھرتی سے پیر اٹھائے بغیر بڑا ادب تخلیق کر رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ خوشی ہماری دوسری خوشیوں کی طرح محض فریب نظر تھی کیونکہ فلیپ کے اگلے ہی پیراگراف میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''اس کی شان بے نیازی بہت سے تخلیقی اور تحقیقی سرمائے کے ضیاع کا سبب بنی، ورنہ دنیا اس کے بہت سے کارناموں سے بہت پہلے ہی آگاہ ہو چکی ہوتی۔'' ہمیں اس ضیاع کا بے حد افسوس ہے، ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہے کہ موصوف بہر حال ان ادیبوں سے بہت بہتر ہیں جن کا ادبی سرمایہ خود تو ضائع نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کے ضیاع کا سبب بن جاتا ہے جو اس سے استفادہ کرتے

ہیں۔

فلیپ میں موصوف کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ انگریزی پر ماں بولی کی طرح قادر ہیں اور ان کے گھر کے نلکے کا پانی پینے والا بھی انگریزی بولنے لگتا ہے۔ یہ اطلاع انتہائی دل خوش کن ہے۔ پاکستان میں جگہ جگہ انگریزی سکھانے کے ادارے قائم ہیں جو لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں لیکن اتنی انگریزی بھی نہیں سکھاتے جتنی انگریزوں کے زمانے میں ان کے بیرے اور باورچی جانتے تھے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر موصوف کے گھر کے نلکے کا پانی بوتلوں کے ذریعہ ملک بھر میں پھیلا کر انگریزی سیکھنے کا مسئلہ حل کر دیا جائے۔ جہاں دکانوں پر ہمدرد کا مشروب مشرق بکتا ہے، وہیں اس مشروب مغرب کو بھی فروخت کے لیے رکھا جا سکتا ہے۔

مرتب سے متعارف ہونے کے بعد ان کی کتاب پر نظر ڈالی جائے تو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ مرتب کے تعارف سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں چھ ادیبوں: ممتاز مفتی، میرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، شفیق الرحمٰن، رام لعل اور ڈاکٹر سلیم اختر کے انٹرویو ہیں۔ سوال نامہ تقریباً ایک ہی جیسے سوالات پر مشتمل ہیں۔ لیکن ہر ادیب کے مزاج اور ادبی کاموں سے چند سوالات دوسروں سے مختلف بھی ہیں۔ سب سے عمدہ جوابات شفیق الرحمٰن کے ہیں۔ ان کا ہر جواب کم سے کم ایک لفظ پر اور زیادہ سے زیادہ دس لفظوں پر مشتمل ہے۔ چند سوال اور ان کے جواب ملاحظہ فرمائیے۔

س۔ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والے زیادہ ہیں اور پڑھنے والے کم؟

ج۔ نقادوں سے پوچھیے۔

س۔ کیا کسی تحریر کی اشاعت کے بعد بھی آپ کو اس میں بہتری کے امکانات کا احساس ہوا؟

ج۔ پتا نہیں۔

س۔ نقادوں کی رائے میں آپ کی انفرادیت کی بنیاد کیا ہے؟

ج۔ یہ انھیں سے پوچھیے۔

س۔ بہترین تحریر میں سب سے اہم وصف کیا ہوتا ہے؟

ج۔ یہ نقاد بتا سکیں گے۔

س۔ آپ کی ابتدائی تحریریں زندگی سے قریب تر تھیں یا موجودہ تحریریں؟

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ج۔ پڑھنے والے بتا سکیں گے۔

س۔ آج سے ۳۰ سال پہلے کے اور موجودہ ادب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ نقاد بتا سکیں گے۔

س۔ آپ کی نظر میں ہمارے تہذیبی مسائل کا حل؟

ج۔ سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔

س۔ آپ نے مزاح نگاری کا انتخاب کیوں کیا؟

ج۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

ممکن ہے ان سوالوں اور ان کے جوابوں کو دیکھ کر بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر شفیق الرحمٰن سے ایسے ہی جواب حاصل کرنے تھے تو ان کو زحمت دینے کی ضرورت کیا تھی۔ ہمارے خیال میں صورتِ حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شفیق الرحمٰن بہت بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے یہاں بھی اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھا ہے اور اپنے جوابوں سے سوالوں کی بے معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ نیز سوال کرنے والے سے یہ کہا ہے کہ تم غلط دروازے پر دستک دے رہے ہو، کوئی اور گھر دیکھو!

ممتاز مفتی کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے ہر سوال کا دوٹوک جواب دیا ہے۔ مثلاً ان سے پوچھا گیا، ''کیا آپ کی کوئی تحریر ایسی بھی ہے جس کے ساتھ آپ کا نام نہ دیا ہو تو بھی لوگ پہچان لیں کہ آپ کی تحریر ہے؟'' مفتی صاحب نے فرمایا، ''میں صاحب طرز ہوں، پہچانی جانی چاہیے۔'' سوال کرنے والے کو مفتی صاحب کے صاحب طرز ہونے کا علم نہیں تھا ورنہ یہ سوال نہ کیا جاتا۔ ویسے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ جس بات کا صرف مفتی صاحب کو علم ہو اس سے دوسرے بھی واقف ہوں۔

ایک اور سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے اپنے ساتھ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کو بھی صاحب طرز تسلیم کیا ہے، لیکن حیرت ہے کہ قدرت اللہ شہاب کو یہ اعزاز عطا نہیں کیا۔ مفتی صاحب کئی مرتبہ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ جو کچھ ہیں، شہاب صاحب ہی کی وجہ سے ہیں۔ اور آج بھی وہ انھیں کے احکام کے تحت مصروفِ عمل ہیں۔ مثلاً کئی سوالوں کے جواب میں انھوں نے کہا ہے، مجھے حکم ہے یہ کام کرو، مجھے حکم ہے یہ کام نہ کرو۔ ظاہر ہے حکم دینے والے قدرت اللہ شہاب

ہی ہوں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں شہاب صاحب نے خود ہی یہ حکم دے رکھا ہو کہ ان کے صاحب طرز ہونے کا راز کسی کو نہ بتایا جائے۔ شاید اسی حکم کی تعمیل میں مفتی صاحب نے شہاب صاحب کو صاحبانِ طرز کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔

مفتی صاحب سے پوچھا گیا کہ وہ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟ فرمایا، میں مطالعہ نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی مفتی صاحب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ان کے پاس کئی سو کتابیں ہیں۔ اس پر ہمیں ایک مشہور غزل گو یاد آ گئے جن کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا لیکن جیب میں ہر وقت کئی کنگھیاں رکھتے تھے۔

اس کتاب میں ہر ادیب سے یہ سوال کیا گیا ہے، ''کیا آپ ایک نعش کے ساتھ اپنے کمرے میں اکیلے رات گزار سکتے ہیں؟'' اس کا جواب میرزا ادیب، ممتاز مفتی اور ڈاکٹر سلیم اختر نے نفی میں دیا ہے۔ ہماری رائے میں کام کچھ ایسا دشوار نہیں ہے۔ ہم ایسے بہت سے ادیبوں کو جانتے ہیں جو اکیلے کمروں میں راتیں گزارتے ہیں جن میں ان کی اپنی تصانیف کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں پہلے ہی اتنی نعشیں ہوں وہاں ایک اور نعش رکھ دینے سے کیا فرق پڑے گا۔

اس سوال کا سب سے عمدہ جواب افسانہ نگار رام لعل نے دیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ان کی ایک عزیزہ کا انتقال ہوا تو اس کی نعش رات بھر گھر بھر میں رکھی رہی۔ تمام گھر والے ایک ایک کمرے کے سو گئے مگر رام لعل نعش کے پاس بیٹھے اپنا ماسکو کا سفرنامہ لکھتے رہے۔ یہ سفرنامہ ہم نے پڑھا ہے۔ یہ ایسا سفرنامہ ہے جو صرف ایک نعش کے پاس بیٹھ کر ہی لکھا جا سکتا ہے، اگر رام لعل کسی زندہ آدمی کی موجودگی میں لکھنے کی کوشش کرتے تو وہ انھیں ہرگز اس کی اجازت نہ دیتا۔

رام لعل کا انٹرویو سب سے دلچسپ ہے اور ان کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان سے پوچھا گیا، کیا آپ کی شخصیت یا فن کے بارے میں کسی قاری یا نقاد کا کوئی ایسا فقرہ ہے جو آپ کو پسند آیا ہو۔ رام لعل نے جواب دیا، ہاں وارث علوی کا یہ فقرہ بہت پسند آیا، ''دنیا کی کوئی طاقت رام لعل کو برے افسانے لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔'' اپنے متعلق اس قسم کے فقرے کو پسند کرنا بڑی ہمت کی بات ہے، ورنہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ ادیب اپنے بارے میں کوئی بے ضرر سا فقرہ سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ ہم نے ایک مرتبہ ایک مشہور ادیب کے بارے میں لکھ دیا تھا کہ ان کی کتابوں سے ہماری شرح ناخواندگی میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ آج تک اس فقرے کو معاف نہیں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کر سکے اور ہم سے سخت ناراض ہیں۔ حالانکہ ناراض ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ شرح ناخواندگی میں اضافے سے نقصان ہمارا ہوا تھا نہ کہ ان کا۔

ویسے وارث علوی کا مذکورہ فقرہ ہمارے نزدیک ناانصافی پر مبنی ہے۔ ایک رام لعل ہی کیا، آج کے کسی بھی لکھنے والے کو دنیا کی کوئی طاقت ایسی تحریریں لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی جیسی کہ وہ لکھتا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو وارث علوی فقرہ بازی نہ کرتے اور ہم بھی کالم نگاری کی بجائے کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کرتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اپنے انٹرویو میں بڑی مزے کی باتیں کی ہیں۔ مثلاً ان سے پوچھا گیا کہ لکھتے وقت آپ کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ فرماتے ہیں، ''شدید اعصابی قسم کا تناؤ ہوتا ہے، چنانچہ دو تین صفحوں کے بعد انگلیوں میں درد شروع ہو جاتا ہے..... اگر میں بہت زیادہ ڈوب کر لکھ رہا ہوں تو بعض اوقات تناؤ کے باعث بازو شل ہو جاتے ہیں۔''

جن تحریروں کے لکھتے وقت ڈاکٹر صاحب کی یہ حالت ہو جاتی ہے، اندازہ کیجیے، ان تحریروں کو پڑھتے وقت ہم پر کیا قیامت گزرتی ہوگی۔

اہلِ قلم یا مرفوع القلم

مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزہ نہ آیا۔ ٹیکس ادا کرنے والوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے حاصل کیے ہوئے ۳۰۔۳۵ لاکھ سوخت ہو گئے اور یار لوگ کہتے ہیں کہ یہ ادیبوں کی کانفرنس نہیں تھی جیالا کانفرنس تھی جس میں اہلِ قلم برائے نام تھے اور مرفوع القلم جمع الجمع کے سیلے میں دندناتے پھر رہے تھے۔

پروین شاکر کہتی ہیں کہ اس کانفرنس میں چالیس فیصد لوگ ایسے شامل ہوئے جن پر غلطی سے بھی ادیب ہونے کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ ایک بزرگ ادیب کے حوالے سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہے کہ نوے فیصد شرکاء ادب سے بے بہرہ تھے۔ یہ شرح ادب بمعنی لٹریچر کی حد تک ہے۔ اگر ادب کے دوسرے معنوں (تہذیب، شائستگی، اخلاقی اصولوں کی پابندی وغیرہ) کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ شرح نوے فیصد سے کچھ زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ ایک شاعر الاعظم کانفرنس کے دوران نہ صرف لوگوں سے لڑتے رہے بلکہ اس لسانی گروہ کو برا بھلا بھی کہتے رہے جس کی زبان میں شاعری کر کے وہ شہرت کماتے ہیں۔

ممتاز صحافی سجاد میر نے اس کانفرنس پر ایک گرما گرم کالم لکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ ساڑھے سات سو ''ادیبوں'' کی اس کانفرنس میں حقیقی ادیب ساڑھے سات سے زیادہ نہیں تھے۔ باقی کے بارے میں وہ فرماتے ہیں، ''اکثر کی اوقات جانتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو کچھ نہیں جانتا۔ جانے کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیسے دانش ور اور ادیب بن گئے۔''

سجاد میر اگر کچھ نہیں جانتے تھے تو انھیں چاہیے تھا کہ جاننے والوں سے پوچھ لیتے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں تھی، پیپلز پارٹی والوں سے ہی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتے کہ جب ایک

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو، جس کا تعلیم و تدریس سے کوئی تعلق نہیں رہا، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین بنایا جاسکتا ہے اور جغرافیے کی ایک استانی کو ہسٹاریکل کمیشن کا صدر مقرر کیا جاسکتا ہے تو سیاسی جلسوں میں نعرے لگانے والوں اور دیواروں پر پوسٹر چپکانے والوں کو دانش ور بنا کر ادیبوں کی کانفرنس میں کیوں نہیں بھیجا جاسکتا۔

سجاد میر پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اکادمی ادبیات سے صرف ادیبوں کا تعلق ہونا چاہیے۔ کسی غیر ادیب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس ادارے کے وسائل کو اپنے غیر ادبی مقاصد کی تحصیل کا ذریعہ بنائے۔ میر صاحب اکادمی کے چیئرمین فخر زماں کو ادیب نہیں مانتے اور انھیں اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں یہ بڑی زیادتی ہے۔ فخر زماں کوئی معمولی ادیب نہیں، بین الاقوامی سطح کے ادیب ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود ان کی نگرانی میں شائع ہونے والا اکادمی کا "خبر نامہ" دیکھ لیجیے جس کے مئی ۱۹۹۴ء کے شمارے میں پہلے صفحے پر واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ فخر زماں "عالمی سطح پر ممتاز شاعر، ادیب اور سیاسی مدبر کے حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔" جب تک سجاد میر یہ ثابت نہ کردیں کہ "عالمی سطح" سے مراد لاہور کی میونسپل حدود ہے، اس وقت تک ان کا بیان ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ویسے سجاد میر کو یہ معلوم ہوجانا چاہیے کہ فخر زماں کے شہر، لاہور کی میونسپل حدود میں صرف ہارن بجانا منع ہے، عالمی سطح کا ادیب ہونے کی ممانعت نہیں ہے۔

سجاد میر کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ فخر زماں کے لیے کچھ ادب ہی ذریعۂ عزت نہیں ہے۔ وہ خدا کے فضل سے اور سازگاریٔ حالات کی بنا پر ہر فن مولا ہیں۔ جملہ علوم و فنون ان کے ہاتھ کا میل ہے۔ اسی لیے ان کے ہاتھ ہمیشہ صاف رہتے ہیں اور وہ کسی غلط کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ ہاتھ ڈالنے کے بعد کام غلط ہوجائے تو اسے حسن اتفاق سمجھنا چاہیے۔ ان کی اسی خوبی کی بنا پر انھیں قومی کمیشن برائے ثقافت و تاریخ کا چیئرمین بنایا گیا ہے۔ اس کمیشن کے تحت ایک درجن علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں: قائداعظم اکیڈمی، مقتدرہ قومی زبان، اقبال اکیڈمی، مرکزی فلم سنسر بورڈ، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس، لوک ورثہ اور قومی تحقیقی ادارۂ تاریخ و ثقافت۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے اداروں کا سربراہ کتنی زبردست صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ ضمنی طور پر یہ اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ قحط الرجال کی

وجہ سے ایک ہی آدمی کو ایک درجن آدمیوں کا کام سنبھالنا پڑتا ہے۔

مذکورہ اداروں سے تعلق کی وجہ سے فخر زماں بیک وقت مختلف محاذوں پر سرگرم عمل ہیں۔ انھوں نے گیارہ جلدوں میں قومی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں، "ہمارے ملک کی تاریخ میں ہیرو ولن بن گئے ہیں اور ولن کو ہیرو بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا تاریخ کو از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے۔" نہایت عمدہ خیال ہے اور اس منصوبے پر ضرور عمل ہونا چاہیے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ سجاد میر جیسے لوگ اس سے خوش نہیں ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ جس پارٹی نے ملک کے جغرافیے کو مسخ کیا تھا، اب وہی تاریخ کو مسخ کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے..... جب دل پر تعجب اور تنگ نظری کی مہر لگ جاتی ہے تو آدمی ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔

سجاد میر ہی نہیں، اور بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فخر زماں کے راتوں رات بین الاقوامی بن جانے سے خوش نہیں ہیں اور ان پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ مثلاً ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ فخر زماں نے اکادمی چیئرمین بنتے ہی اسلام آباد، لاہور، کراچی اور بعض دیگر شہروں میں اپنے اعزاز میں جلسے کرائے۔ یہ جلسے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہوئے جن پر اکادمی نے بھاری رقوم صرف کیں۔ یہ اعتراض انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اکادمی کی طرف سے اس کا چیئرمین اپنے اعزاز میں جلسے نہیں کرائے گا تو کیا سجاد میر کے اعزاز میں کرائے گا۔ معترض کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اکادمی کا چیئرمین کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اسے وزیر مملکت کا درجہ ملا ہوا ہے۔ اس کے اعزاز میں جلسے فٹ پاتھوں پر تو نہیں ہوسکتے۔ چیئرمین کے شایان شان جلسوں کے لیے بڑے ہوٹل ہی موزوں ہوسکتے ہیں۔ اکادمی نے اگر ان جلسوں پر بھاری رقوم صرف کیں تو کیا ہوا۔ اکادمی کو معذور ادیبوں کی مدد کے لیے حکومت سے خاصی بڑی رقم ملتی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ رقم معذور ادیبوں کو نقد ادا کی جائے۔ کسی بڑے ہوٹل میں مدعو کرکے ان کی تواضع پر بھی یہ رقم صرف کی جاسکتی ہے۔ کیسی عمدہ بات ہے کہ چیئرمین کے اعزاز میں جلسہ بھی ہوگیا اور معذور ادیبوں کی تواضع بھی ہوگئی۔ ایک پنتھ دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔

فخر زماں پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اپریل ۱۹۹۴ء میں اکادمی ادبیات کا چیئرمین مقرر ہونے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ۱۴ر اگست ۱۹۹۴ء کو ادبی خدمات کے صلے میں ستارۂ امتیاز حاصل کرلیا۔ ادبی خدمات سے مراد شاید وہی جلسے ہیں جو اپریل سے اگست تک ان

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کے اعزاز میں ہوتے رہے۔

ادیبوں کو اکادمی کی سفارش پر اعزازات ملتے ہیں اور اکادمی کے چیئرمین کی منظوری کے بغیر کسی ادیب کو اعزاز کی سفارش نہیں کی جا سکتی۔ معترض کہتے ہیں کہ یہ کیسا چیئرمین ہے جس نے بہت سے سینئر ادیبوں کی حق تلفی کر کے اعزاز کے لیے خود اپنا نام پیش کر دیا۔ یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ جس شخص کا اپنا ستارہ اوج پر ہو، اس کے لیے ستارۂ امتیاز کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ سول اعزازات میں ستارۂ امتیاز کمتر درجے کا اعزاز ہے، اگر فخر زماں چاہتے تو وہ اپنے آپ کو ستارۂ پاکستان یا کم از کم ہلال پاکستان کے لیے نامزد کر سکتے تھے۔ لیکن منکسر مزاجی کی وجہ سے انھوں نے بڑے اعزازوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا اور ایک چھوٹے سے اعزاز کے لیے اپنے آپ کو نامزد کر دیا۔ ان کا یہ ایثار لائق صد ستائش ہے مگر افسوس کوتاہ نظر مخالفین کو اس خوبی میں بھی برائی کا پہلو نظر آ گیا۔

فخر زماں پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ اکادمی کی ساری ریوڑیاں خود ہی کھائے جا رہے ہیں اور فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ستمبر ۱۹۹۴ء کے آخری ہفتے میں پاکستانی ''ادیبوں'' کا جو وفد چین گیا تھا، اس میں فخر زماں نے نہ صرف یہ کہ غلام مصطفیٰ شاہ جیسے ادیبوں اور تعصب پیشہ لوگوں کو شامل کیا بلکہ وفد کے قائد کی حیثیت سے خود بھی چین کی سیر کر آئے۔ اگر احمد ندیم قاسمی یا شوکت صدیقی جیسے کسی بڑے ادیب کو جس کی تحریروں کی چینی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، وفد کا قائد بنایا جاتا تو اس سے وفد کے وزن اور وقار میں اضافہ ہوتا۔

یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے، اگر فخر زماں نے چین کی سیر کر لی تو کون سا غلط کام کیا۔ جو ان آدمی کو سیر و سیاحت سے دلچسپی ہوتی ہے اور فخر زماں کو تو چین کا سفر نامہ بھی لکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ چین کا سفر کیے بغیر تو وہ سفر نامہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ خدا جانے کل کیا ہو، پیپلز پارٹی کی حکومت رہتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ پانسا پلٹ جاتا ہے تو پھر چین تو کیا، لاہور سے چھانگا مانگا تک جانا بھی مشکل ہو جائے گا۔ جن لوگوں کو مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا تجربہ ہے وہی فخر زماں کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

غلام مصطفیٰ شاہ جیسے غیر ادیبوں کو بھی چین کی سیر کرانا حکمت سے خالی نہیں ہے۔ ممکن ہے

آب و ہوا کی تبدیلی سے ان کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے اور تعصب جیسی مہلک بیماری سے انھیں نجات مل جائے۔

احمد ندیم قاسمی یا شوکت صدیقی کو وفد کا قائد بنانے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ عین وقت پر چین جانے سے انکار کر دیتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان دونوں نے اہل قلم کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ ان دونوں کے کانفرنس میں شریک نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کا اور ان جیسے متعدد دوسرے ممتاز اور بزرگ ادیبوں (مثلاً شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی وغیرہ) کا اہل قلم کانفرنس میں نہ شرکت نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے شناختی کارڈ میں والد کے نام کا خانہ خالی رہ جائے۔

اس بات سے بھی ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی میں سے کوئی ایک چین جانے والے وفد کا قائد ہوتا تو وفد کے وزن اور وقار میں اضافہ ہو جاتا۔ وقار تو ایک تصوراتی چیز ہے لیکن جہاں تک وزن کا تعلق ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ مذکورہ دونوں ادیب تو کیا، ان جیسے دس ادیب بھی وزن میں اتنا اضافہ نہیں کر سکتے تھے جتنا اکیلے فخر زماں کی وجہ سے ہوا۔

ایک اور اعتراض، جس سے مخالفین کی بیمار ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ ہے کہ فخر زماں نے اکادمی ادبیات کو اپنی ذات کا تابع مہمل بنا رکھا ہے۔ جب سے وہ اکادمی کے چیئرمین ہوئے ہیں، اکادمی کا خبر نامہ، ان کا ذاتی روزنامچہ بن کر رہ گیا ہے۔ ان کے خبر نامے میں ان کا ذکر خیر اس کثرت سے ہوتا ہے جیسے پاکستان میں صرف وہی ایک ''ادیب'' رہ گئے ہیں، باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خبر نامے میں موصوف کی تصویریں بھی اس کثرت سے چھپتی ہیں جیسے یہ کوئی فلمی رسالہ ہو۔ یہ ساری باتیں اتنی فضول ہیں کہ انکا جواب دینے کی بجائے ہم معترضین کو مشورہ دیں گے کہ وہ اکادمی کے خبر نامے کو فلمی رسالہ سمجھ کر ہی پڑھ لیا کریں۔ آخر اکادمی کے چیئرمین مرکزی فلم سنسر بورڈ کے بھی تو نگران اعلیٰ ہیں۔

کوئی کچھ بھی کہے ہم صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ فخر زماں نے اکادمی کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی ہے۔ انھوں نے ایسے کئی منصوبوں پر کام کرنے کا اعلان کیا ہے جن سے ہمارے ادب اور ادیبوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔ ان منصوبوں میں سرفہرست یہ ہے کہ پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات کو دنیا کی کئی بڑی زبانوں، مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور عربی وغیرہ میں منتقل کیا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

جائے گا۔ یہ بہت عمدہ منصوبہ ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن ادیبوں کو خود ان کی زبان میں پڑھنے والے میسر نہیں ہیں، انھیں غیر زبانیں جاننے والے قارئین مل جائیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ پاکستانی ادب، اکادمی کے چیئرمین کے تخلیق کردہ "ادب" کی طرح، عالمی سطح کا ادب بن جائے گا اور کوئی تعجب نہیں کہ اگلے چند برسوں میں نوبل انعام کسی پاکستانی ادیب کو مل جائے۔

اکادمی ادبیات کو ہم مشورہ دیں گے کہ ترجمے کے سلسلے میں ذرا احتیاط سے کام لیا جائے۔ ان تخلیقات کو ترجیح دی جائے جو غیر زبانوں کے ادب سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہیں تاکہ یہ تخلیقات جب اپنی اصل زبانوں میں منتقل ہوں تو پڑھنے والوں کو مغایرت کا احساس نہ ہو۔

اکادمی کا دوسرا بڑا منصوبہ یہ ہے کہ چھ جلدوں میں پاکستان کا مزاحمتی ادب شائع کیا جائے گا۔ سجاد میر نے اپنے مذکورہ کالم میں لکھا ہے کہ مزاحمتی ادب کے نام سے جو لکھا گیا ہے، وہ سرے سے ادب ہی نہیں ہے۔ لاغر مراد آبادی فرماتے ہیں کہ مزاحمتی ادب اسے کہتے ہیں جو تحقیق ادب کی راہ میں مزاحم ہو۔ مگر ہم اتنے انتہا پسند نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جس طرح فلموں کے باتصویر پوسٹروں اور ٹرکوں پر بنی ہوئی تصویروں کو مصوری کے نمونے سمجھا جاتا ہے، اسی طرح نیم خواندہ لوگوں کی لکھی ہوئی سیاسی و صحافتی تحریروں کو بھی ادب تسلیم کر لینا چاہیے۔

ادبی سازندے

اس ناقدری کے دور میں ہم جن چند ادیبوں کے دل سے قدردان ہیں، ان میں جاذب قریشی بھی شامل ہیں۔ وہ صفِ اوّل کے شاعر، صفِ دوم کے نقاد اور صفِ سوم کے ادبی صحافی ہیں۔ گویا ایوانِ ادب کی پہلی تین صفوں میں وہ بیک وقت دکھائی دیتے ہیں، اور اس شان سے کہ ان صفوں میں موجود ان کے معاصرین ان کے سامنے ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے غالب کے سامنے غالب کے معاصرین۔

کالم کے شروع ہی میں ہم نے جاذب قریشی کی اتنی مبالغہ آمیز تعریف اس لیے کر دی ہے کہ اگر کالم کے ختم ہونے تک ہم سے کوئی لغزش ہو جائے تو موصوف حسبِ سابق ہم سے ناراض نہ ہوں بلکہ ہماری مجبوری کو دیکھتے ہوئے درگزر سے کام لیں۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارا کوئی کالم یا کالم لغزشوں سے پاک نہیں ہوتا۔

حسبِ سابق ناراض ہونے کی بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے ہم نے دو مرتبہ جاذب قریشی کے بارے میں کالم لکھا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے دونوں مرتبہ وہ ہم سے ناراض ہو گئے۔ پہلی مرتبہ ہم نے موصوف کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ کسی ادبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ وہ جمعیت القریش کے بھی باقاعدہ رکن نہیں ہیں۔ دوسری مرتبہ ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ جاذب قریشی کا کلام اس لائق ہے کہ سمندر میں پھینک دیا جائے تاکہ کلام کی تاثیر سے سمندر کا پانی میٹھا ہو جائے اور کراچی والوں کو دور دراز علاقوں سے پانی حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یہ دونوں باتیں ہم نے خلوص سے لکھی تھیں۔ ہم واقعی جاذب قریشی کو گروہ بندی سے بالا سمجھتے ہیں اور ان کی شیریں سخنی کے دل سے قائل ہیں۔ لیکن انھوں نے سمندر اور جمعیت القریش کے حوالوں کو ناپسند فرمایا اور ناراض ہو گئے۔ حالانکہ ناراض جمعیت القریش والوں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کو ہونا چاہیے تھا کہ ان کا پیشہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ آبرومندانہ ہے کیونکہ گوشت کی قیمت آئے دن بڑھتی رہتی ہے اور شاعری کی قدر و قیمت مسلسل کم ہو رہی ہے۔

جاذب قریشی ہم سے ناراض ہوئے تو انھوں نے ایک عرصے تک ہم سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ہم نے بھی اس دوران ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ کسی ناراض کو مزید ناراض کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اب جب کہ موصوف نے دوبارہ ہمیں شایانِ التفات سمجھا ہے اور اپنی نئی کتاب ''میری تحریریں'' عنایت فرمائی ہے تو ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ انھوں نے نہ صرف ہماری سابقہ غلطیوں کو معاف کر دیا ہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی غلطیاں کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ کالم لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

''میری تحریریں'' جناب جاذب کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی وہ تمام تحریریں یکجا کر دی ہیں جو انھوں نے اخبار ''جنگ'' کراچی کے ادبی صفحے کے نگراں کی حیثیت سے لکھی تھیں۔ یہ تحریریں اداریوں، کتابوں پر تبصروں، ادبی محفلوں کی رودادوں اور انٹرویوز پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے بعض بدذوق معترضین یہ کہیں کہ اس قسم کی تحریریں لکھ کر عموماً ضائع کر دی جاتی ہیں مگر جاذب قریشی نے انھیں کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ معترضین کو ہم یہ جواب دے کر خاموش کر سکتے ہیں کہ آج کل کسی کتاب کا شائع ہونا، ضائع ہونے کے مترادف ہے لیکن معترضین کو خاموش کرنے میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے ہم یہ عرض کریں گے کہ جاذب قریشی نے یہ کتاب شائع کر کے ہمارے ادب کے ایک خاص دور کی تاریخ کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دور کے ادب کی تاریخ تو کیا، خود ادب بھی محفوظ کیے جانے کے لائق نہیں ہے۔

اس کتاب کی جس خوبی نے ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا، وہ اس کا نام ہے۔ جیسا نام ہے ویسی ہی کتاب ہے۔ یعنی صحیح معنوں میں اسم بامسمّٰی ہے۔ کتاب میں شامل ہر تحریر زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مجھے جس نے لکھا ہے وہ جاذب ہے، اگر کوئی دوسرا ملکیت کا دعویٰ کرے تو کاذب ہے۔ ان تحریروں کو جاذب کے سوا کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ لکھتا تو کیا، انھیں پڑھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ ان میں نہایت سنجیدہ ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں، جب خود ادب ایک غیر سنجیدہ کام بن کر رہ گیا ہے، سنجیدہ ادبی مسائل کی طرف توجہ کرنے کی زحمت کون اٹھاتا ہے۔

بعض کوتاہ نظر معترضین یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کا نام اس کے مطالب سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس میں شامل تمام تحریریں جاذب قریشی کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ مثلاً اس میں شامل تمام انٹرویوز میں جاذب کے مختصر سوالات کے جو طویل جوابات دیئے گئے ہیں، انھیں جاذب کی ''تصنیف'' نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کتاب میں ۱۴ صفحات کا ایک ایسا مضمون بھی شامل ہے، جس میں جاذب کا حصہ ابتدائی اور اختتامی کلمات تک محدود ہے، باقی جو کچھ ہے وہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر قمر رئیس، جوگندر پال اور محمد علی صدیقی کی باہمی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس گفتگو کو جاذب اپنی تحریروں میں شامل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ جب کوئی موسیقار کوئی دھن مرتب کرتا ہے تو وہ بہت سے سازندوں سے کام لیتا ہے۔ یہ دھن سازندوں کے نام سے نہیں موسیقار کے نام سے منسوب ہوتی ہے۔ اسی طرح کتاب میں جتنے بھی انٹرویو اور گفتگوئیں شامل ہیں، ان میں شریک ہونے والوں کی حیثیت سازندوں کی سی ہے۔ جاذب قریشی ایک موسیقار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں..... ایک ایسا موسیقار جو اچھی دھنیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

کتاب کے شروع میں صرف تین دیباچے ہیں جو ممتاز ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ عالمانہ کتاب اس سے زیادہ دیباچوں کی مستحق تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کتاب کے ہر مضمون کے لیے الگ دیباچہ ہونا چاہیے تھا تاکہ جو لوگ مضامین کی خوبیوں سے براہِ راست مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ دیباچہ نگاروں کی مدد سے منزلِ مراد تک پہنچ جاتے۔ سب سے پہلا دیباچہ مشہور شاعر اور صحافی محمود شام کا ہے جس میں انھوں نے کئی انکشافات کیے ہیں۔ مثلاً یہ بتایا ہے کہ جاذب قریشی فلمی دنیا سے وابستہ تھے مگر یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے فلمی دنیا کو چھوڑ کر ادبی دنیا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے کیوں سرفراز کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ جاذب قریشی کو بروقت معلوم ہو گیا ہوگا کہ فلمی شہرت ناپائیدار اور بے اعتبار ہوتی ہے۔ کل کے مقبول ترین اداکاروں کو آج کوئی نہیں جانتا۔ اس کے برعکس ادب میں کام باقی رہے نہ رہے نام ضرور باقی رہ جاتا ہے۔ استاد ذوق کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کے انتقال کو تقریباً ڈیڑھ سو سال ہو چکے ہیں۔ ان کا تین چوتھائی کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا اور باقی امتدادِ زمانہ سے نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گیا۔ لیکن استاد کا نام آج بھی زندہ ہے۔ ادب کی یہی کوشش بہت سے لوگوں کو اپنا اصل کام

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

محمود شام نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پورے پاکستان میں اور باہر کے ملکوں میں بھی جاذب قریشی کی پہچان ان کی شاعری ہے۔ پاکستان کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ جاذب قریشی کے مجموعۂ کلام کا نام ہی "پہچان" ہے، لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ موصوف پاکستان سے باہر بھی پہچانے بلکہ خوب اچھی طرح پہچانے جاتے ہیں۔ ہم اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شاعری اور شاعروں کی قدر صرف ہمارے ملک میں ہوتی ہے۔ الحمدللہ کہ دوسرے ممالک بھی سخن فہمی کی دولت سے محروم نہیں ہیں۔ کشور ناہید، ساقی فاروقی اور افتخار عارف کے کلام کے انگریزی تراجم شائع ہو چکے ہیں مگر ان تینوں کو پاکستان سے باہر بھی وہ لوگ جانتے ہیں جو پاکستان سے باہر گئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے جاذب قریشی کے کلام کا انگریزی میں تو کیا، اُردو سے سلیس اُردو میں بھی ترجمہ نہیں ہوا، اس کے باوجود انھیں عالمی سطح پر پہچانا جاتا ہے۔ اس سے مذکورہ تینوں شاعروں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے اور یہ جاننا چاہیے کہ اگر کلام میں جان نہ ہو تو اس کا انگریزی میں تو کیا، سری لنکا، نیپال اور بھوٹان کی زبانوں میں بھی ترجمہ کرا لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

یہاں تک تو کالم کی تمہید تھی، آیئے اب اصل کتاب کی سیر کریں۔ اس کا پہلا حصہ ان اداریوں پر مشتمل ہے جو اخبار "جنگ" کے ادبی صفحے پر لکھے گئے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اور اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ ان اداریوں میں نہایت سنجیدہ ادبی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جاذب قریشی کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مشاعروں کی افادیت کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ مشاعروں کی اصلاح کی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اصلاح کی صرف شاعروں کو ضرورت ہوتی ہے مگر جاذب کے توجہ دلانے پر احساس ہوا کہ مشاعرے بھی اصلاح طلب ہوتے ہیں۔ موصوف کو شاعروں میں جو خرابیاں نظر آتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں اچھے شاعروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں پر گانے والوں کو ترجیح دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں مشاعرے میوزیکل شو بن جاتے ہیں۔ ہندوستان سے جن شعرا کو بلایا جاتا ہے، ان میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو اپنی آوازوں کے ساتھ "لچکتی، ابھرتی اور پھیلتی ہیں۔" ہندوستانی شاعرات کی تقلید میں پاکستان میں بھی چند ایسی شاعرات پیدا ہو چکی ہیں جو اپنی بے سری گائیکی سے ناظرین و سامعین کو

اپنی طرف راغب کرنا چاہتی ہیں۔ مشاعروں کے سامعین بھی شاعروں کی طرح غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں جو اچھے شعروں پر خاموش رہتے ہیں اور برے شعروں پر داد دیتے ہیں۔ مشاعروں کی نظامت کرنے والے بھی حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھتے۔ اہم شاعروں کو شروع میں اور جاننے والوں کو آخر میں پڑھواتے ہیں۔ مشاعروں کے منتظمین ایسے شاعروں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی خوشامد کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے شاعروں کو کلام سنانے کا موقع نہیں ملتا۔

یہ ساری خرابیاں جن کی طرف جاذب قریشی نے توجہ دلائی ہے، نہایت افسوس ناک ہیں۔ ایک آدھ خرابی ہوتی تو اصلاح کی گنجائش تھی مگر یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یہ خرابیاں آسانی سے دور نہیں ہو سکتیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ایک بااختیار کمیشن مقرر کرے جو صورت حال کا جائزہ لے کر مشاعروں کی اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرنے اور پھر انھیں نافذ کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہو۔ ہم اس کمیشن کی سربراہی کے لیے جناب جاذب کا نام پیش کرتے ہیں کیونکہ انھیں مشاعروں میں شرکت اور عدم شرکت کا وسیع تجربہ ہے۔ ان کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ تحت اللفظ میں کلام پڑھتے ہیں۔ انھیں اکثر مشاعروں میں بلایا نہیں جاتا۔ بلایا جاتا ہے تو پڑھوایا نہیں جاتا۔ پڑھوایا جاتا ہے تو شروع ہی میں پڑھوا دیا جاتا ہے۔ ان ذاتی خصوصیات اور تجربات کی بنا پر وہ مجوزہ کمیشن کی سربراہی کے فرائض نہایت عمدگی سے ادا کر سکتے ہیں اور چاہیں تو کمیشن کی طرف سے اپنی مرضی کے مطابق مشاعرے بھی منعقد کرا سکتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں کتابوں پر تبصرے ہیں۔ جاذب قریشی صاحب نظر تبصرہ نگار ہیں۔ انھیں کتاب کی روح تک پہنچنے کا فن آتا ہے بشرطیکہ کتاب بے روح نہ ہو۔ افسوس کہ انھوں نے جن کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں، ان میں بیشتر ایسی ہیں جن کا چھپنا نہ چھپنا برابر ہے۔ اس اعتبار سے ان تبصروں کو غیر اہم موضوعات پر اہم تنقیدی تحریریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں سلیم احمد مرحوم یاد آ رہے ہیں۔ وہ بڑے بامروت آدمی تھے۔ ان کے پاس جب کوئی شاعر اپنا کلام لے کر پہنچتا اور کچھ لکھنے کی درخواست کرتا تو وہ اسے مایوس نہیں کرتے تھے۔ کراچی کے تیسرے درجے کے شاعروں میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جس کے بارے میں انھوں نے کچھ نہ لکھا ہو۔ ایک مرتبہ ہم نے سلیم احمد سے کہا، آپ بڑے تنقید نگار ہیں، آپ کو چھوٹے چھوٹے شاعروں پر مضمون نہیں لکھنے چاہئیں۔ بڑی تنقید بڑے موضوع پر ہی لکھی جا سکتی ہے۔ یہ سن کر مسکرائے اور کہا، جس

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

طرح مال پر زکوٰۃ دی جاتی ہے، اس طرح علم پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ میں چھوٹے شاعروں پر لکھ کر انھیں احساس محرومی سے بچاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاذب قریشی بھی تبصرے لکھ کر اپنے علم کی زکوٰۃ دیتے ہیں۔ وہ صاحب نصاب نہیں ہیں، یعنی زکوٰۃ ان پر واجب نہیں، اس کے باوجود زکوٰۃ دینا ان کی فیاضی کی دلیل ہے۔

کتاب میں چند انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں محمود شام نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "یہ کوئی عام صحافی اور ادیب کے انٹرویو نہیں ہیں بلکہ ایک ادیب کے دوسرے ادیب وہ مکالمے ہیں جن میں اپنے عہد کے ادبی موضوعات پر محض سوال و جواب ہی نہیں بھرپور تبادلہ خیال موجود ہے۔" ہمیں اس رائے سے صد فیصد اتفاق ہے۔ جناب جاذب انٹرویو لیتے وقت ایسے فکر انگیز سوال اٹھاتے ہیں کہ جواب دینے والا معلومات کے انبار لگا دیتا ہے۔ مثلاً ایک انٹرویو میں انھوں نے سوال کیا، "آپ کو مچھلی کے شکار سے بھی شوق رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ بتایئے۔" افسوس کے کالم کی محدود گنجائش کی وجہ سے ہم اس سوال کا جواب نقل نہیں کر سکتے ورنہ قارئین کو معلوم ہو جاتا کہ فکر انگیز سوالوں کے جواب کیسے بے فکری سے دیئے جاتے ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جو لوگ بیک وقت نظم اور نثر دونوں میں اظہار خیال کرتے ہیں، وہ اچھے شاعر بن پاتے ہیں نہ اچھے نثر نگار۔ مگر جاذب قریشی اس کلیہ سے استثنا کی مثال ہے۔ وہ شاعر بھی بہت عمدہ ہیں اور نثر نگار بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مضامین اگرچہ صحافتی ضروریات کے تحت لکھے گئے ہیں لیکن ان کی نثر کڑے سے کڑے ادبی معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔ ان کے بعض جملے تو اچھے شعروں کی طرح دل پر اثر کرتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کے جملے پوری کتاب میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔

- "شاعری نے ہمیشہ محبت کے مہکتے ہوئے موسموں اور انصاف کے چمکتے ہوئے زمانوں کو اپنی تقویم میں لکھا ہے۔"
- "جب ادب کا سکہ بنا تو اس کے پہلے رخ پر شاعری کا چہرہ تخلیق کیا گیا۔"
- "عذاب آسمانوں سے بھی اتارے گئے اور زمین پر بھی انھیں جنم دیا گیا۔ ہر عہد اپنے تازہ لہو کی پکار بن کر چمکتا ہے اور ہر زمانہ اپنی محبتوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔"

جاذب قریشی اور کچھ نہ کریں، اس قسم کے جملے ہی لکھتے رہیں تو ان کا نام زندہ رہے گا۔

اک جان کا زیاں

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میری ساری زندگی لفظوں ہی کی رفاقت میں گزری ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں یہ لفظ میرے وفادار دوست اور رفیق بن کر رہے ہیں۔ میں ان کی رفاقت کا ہی نہیں وفاداری کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے ہر غم اور میری ہر خوشی کو اپنا غم اور اپنی خوشی سمجھا اور جو کچھ میں نے محسوس کیا، اسے پیرایہ اظہار عطا کر دیا۔ لیکن اس وقت یہ الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ زندگی بھر میرے غموں اور میری خوشیوں میں شریک رہنے والے الفاظ اس طرح اجنبی بن گئے ہیں جیسے ان سے میرا کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ یہی نہیں، مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ان لفظوں کا اپنے معانی کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ لفظوں سے جب ان کے معانی جدا ہو جائیں تو وہ بے جان نقوش بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں بے جان نقوش کے ذریعے اپنا دکھ کس طرح بیان کر سکتا ہوں!

میں اپنا یہ دکھ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اور محمد صلاح الدین کے درمیان خون کی لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک کا جسم اور ایک کی آنکھیں خوں بار ہیں، زخم زخم جسم کے چہرے کو تو وہ ابدی مسکراہٹ مل گئی جو شہادت کی دلیل ہے، لیکن میری خونابہ آنکھوں کو کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ ہاں کانوں میں مرزا مظہر جان جاناں شہید کا یہ مصرع گونج رہا ہے کہ

ع ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

محمد صلاح الدین ایک فرد کا نہیں، ایک اسلوب حیات کا نام ہے۔ اس اسلوب حیات کے لیے اگر ایک لفظ کا انتخاب کیا جائے تو وہ سوائے "عبادت" کے کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا۔ بندے کا خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا عبادت ہے۔ یہ عمل انسان کے خارج و باطن، دونوں سے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

گہرا تعلق رکھتا ہے، اسی لیے عبادت حسن نیت بھی ہے اور حسن عمل بھی۔ محمد صلاح الدین کی زندگی حسن نیت اور حسن عمل کا بہترین امتزاج تھی۔ انھوں نے اپنے خدا کی خوشنودی کی خاطر، خدا کے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے امکانی حد تک کوشش کی، اور اسی فرض کو ادا کرتے ہوئے اپنی جان اسی کو لوٹا دی جس کی یہ امانت تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ محمد صلاح الدین کی شہادت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے، لیکن میں شہادت کو سانحہ نہیں کہہ سکتا، شہادت تو خداوند کریم کی بزرگی و عظمت کی گواہی ہے اور ایک ایسا انعام جس سے خدا اپنے برگزیدہ بندوں ہی کو نوازتا ہے۔ میں محمد صلاح الدین کی شہادت کو ایک تاریخ ساز قومی واقعہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک کذب پرور معاشرے کی تاریکیوں کے مقابل اپنے خون سے سچائی کی ایسی شمع روشن کر دی جو ہمیشہ اس حقیقت کا احساس دلاتی رہے گی کہ تاریکیوں سے نبرد آزما ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

مرحوم سے میرے تعلق کے کئی حوالے بنتے ہیں، لیکن اس وقت میں ذاتی حوالے ہی سے بات کروں گا، جب میں ان کی شہادت پر غور کرتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ مجھے ایک ایسے انسان سے قربت کا شرف حاصل تھا جس نے اصولوں کی خاطر زندگی بسر کی اور بالآخر اصولوں ہی کی خاطر جان دے دی۔ اپنے بست سالہ تعلقات کے دوران میں نے انھیں ایک ایسا مخلص سچا اور کھرا انسان پایا جس کی مثال کتابوں میں تو مل جاتی ہے، عملی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ جس طرح صوفیہ نفی ذات کے مرحلے سے گزر کر بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اسی طرح محمد صلاح الدین نے اپنی ذات کے لیے زندہ رہنا ترک کر کے، دوسروں کی خاطر جینے کو مقصود حیات بنا رکھا تھا۔ قید و بندگی کی صعوبتوں سے لے کر شدید بیماریوں کی تکالیف تک کوئی ان کو اپنے مقصد سے باز نہ رکھ سکا، اپنے لیے تو ہر شخص زندہ رہ لیتا ہے، لیکن اپنے آپ کو نظر انداز کر کے دوسروں کے لیے زندہ رہنا بہت مشکل بلکہ بہت ناممکن ہے، محمد صلاح الدین نے اسی ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

گزشتہ بیس برسوں کی بے شمار ملاقاتوں کی یادیں میرے ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں، لیکن ان سب یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا میرے لیے عملاً ناممکن ہے۔ میں صرف دو واقعات بیان کرتا ہوں، جن سے مرحوم کی شخصیت کے دو خوبصورت پہلو سامنے آتے ہیں۔

ایک روز وہ میرے ہاں تشریف لائے تو دوران گفتگو میں نے محسوس کیا کہ ان پر نقاہت کا غلبہ ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا وہ ذیابیطس کے مریض ہیں، اس لیے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس وقت ان کے خون میں شکر کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ میرے گھر کے قریب ہی ذیابیطس کے ایک ماہر ڈاکٹر کا مطب ہے، میں انھیں وہاں لے گیا۔ ڈاکٹر نے انھیں نہایت توجہ سے دیکھا اور دوا تجویز کی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد وہ اس ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کرانے لگے۔ اسی دوران ڈاکٹر نے صلاح الدین صاحب کو یہ بتایا کہ ایک بینک کے اہلکاروں نے ان کے کئی لاکھ روپے جعلی چیکوں کے ذریعے نکلوا لیے ہیں اور بینک کے افسر مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے رقم ڈوبتی نظر آ رہی ہے۔ مرحوم نے جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ ڈاکٹر کا موقف درست ہے تو انھوں نے متعلقہ لوگوں سے رابطہ کیا اور کئی ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ڈاکٹر کی رقم واپس دلا دی، اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد صلاح الدین صاحب سے میری بات ہوئی تو میں ان سے پوچھا کہ ان کا علاج کیسا ہو رہا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اب کسی دوسرے ڈاکٹر سے علاج کرانے کی سوچ رہے ہیں۔ ہم نے اس کی وجہ معلوم کی تو انھوں نے کہا، ''میں نے ڈاکٹر صاحب کی جو مدد کی ہے، اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ فیس نہ لیں، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ان سے علاج کراؤں۔''

دوسرا واقعہ خود میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میں یہ واقعہ بیان نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس سے خودستائی کا پہلو نکلتا ہے، لیکن اسے بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے مرحوم کا یہ وصف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس کس طرح سے اپنے نیازمندوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے کالم نگاری کی راہ پر اگرچہ جناب الطاف حسن قریشی نے لگایا تھا، لیکن اس راہ پر چلتے رہنے کا حوصلہ صلاح الدین مرحوم کی وجہ سے ملا۔ اگر ان کی ہمت شامل حال نہ ہوتی تو میں یہ کام جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا، انھی کی فرمائش پر لکھا اور انھی کے لیے لکھا۔ جب وہ جسارت کے مدیر تھے تو میں اس کا کالم نگار تھا۔ انھوں نے جب ''جسارت'' کی ادارت چھوڑی تو میں نے بھی کالم لکھنا بند کر دیا تھا۔ ''جسارت'' کے نئے مدیر نے مجھ سے کالم نگاری جاری رکھنے کے لیے کہا تو میں نے جواب دیا، میں تو لکھتا ہی صلاح الدین صاحب کے لیے تھا، جب وہ اخبار کے مدیر نہیں رہے تو میں کس کے لیے لکھوں۔ ۱۹۸۴ء میں جب مرحوم نے ''تکبیر'' جاری کیا تو اس کے پہلے شمارے سے میں نے اس میں لکھنا شروع کر دیا۔ اگست ۱۹۹۰ء تک باقاعدگی سے لکھتا رہا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہا، لیکن پھر بعض ذاتی وجوہ سے میں نے بادل ناخواستہ لکھنے سے معذرت کر لی۔ مگر صلاح الدین مرحوم نے میری معذرت قبول نہ کی اور مسلسل اصرار کرتے رہے کہ میں دوبارہ کالم لکھنا شروع کر دوں۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی یا فون پر بات ہوتی تو وہ یہ ضرور پوچھتے، جس کام کی وجہ سے میں نے کالم نگاری چھوڑی ہے، وہ مکمل ہوا یا نہیں؟ مارچ ۱۹۹۴ء کے شروع میں وہ سعودی عرب کے دورے سے واپس آئے تو مجھے فون کیا اور کہا، اب تک تو میں آپ ہی سے کہتا رہا ہوں کہ ''تکبیر'' کے لئے لکھئے، لیکن اس مرتبہ میں نے حرمین میں دعا کی ہے کہ آپ لکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔ میں یہ سن کر کانپ گیا اور کہا، ''صلاح الدین صاحب اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنی بڑے بارگاہ میں دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی، میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، میرے اس جواب سے وہ بے حد خوش ہوئے۔'' مارچ ۱۹۹۴ء کو انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس کا ابتدائی حصہ یہ ہے.....

''سعودی عرب سے واپسی کے بعد آپ سے ٹیلیفون پر ہونے والی گفتگو میرے لیے دعائے حرمین کے مستجاب ہونے کی علامت ثابت ہوئی۔ میں آپ کے عزم نو پر اللہ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کالم کا سلسلہ بند کرنے کی اطلاع آپ نے مجھے ایک خط کے ذریعہ دی تھی، اور اس کا سبب بھی بیان فرما دیا تھا۔ اب آپ کے مسرت انگیز فیصلہ پر مجھے جو راحت قلب حاصل ہوئی ہے اس کا اظہار روبرو بیٹھ کر کرنا چاہوں تو میری زبان دل کی رفاقت کا حق ادا نہ کر سکے گی، اسی لیے خط کا سہارا لے رہا ہوں اور چند ایسی باتیں ضبط تحریر میں لانے کی جرأت کر رہا ہوں جو آپ کے سامنے زبان پر لانا ناممکن ہوگا۔

آپ نے تکبیر کے عہد طفولیت میں کالم نہیں لکھا بلکہ اسے قوت و توانائی بہم پہنچانے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے کے لیے انتہائی ایثار سے کام لیا اور اہل تکبیر کی سرپرستی فرمائی۔ مشکلات کے اس دور میں ہم آپ کی کوئی خدمت بھی نہ کر سکے، لیکن اللہ گواہ ہے کہ آپ کے ایثار اور جذبہ سرپرستی نے نہ صرف مجھے بلکہ تکبیر کے ہر رکن کو بہت متاثر کیا اور آپ ہمارے دلوں میں اس طرح بس گئے کہ جب اپنی مجبوریوں کے باعث آپ نے کالم بند کرنے کی اطلاع دی تو ہم ایک بڑے صدمہ کی سی کیفیت سے دوچار ہوئے۔

آپ کی عظمت کا نقش ہمارے قلب و ذہن میں بعد میں اور گہرا ہوا، جب ہم نے دیکھا کہ

بڑے اخبارات کی بڑی اونچی پیشکشوں کے باوجود آپ کالم لکھنے پر آمادہ نہ ہوئے اور تکبیر سے کیے گئے وعدے کی پوری پاسداری کی۔ اب آپ نے بحالی کالم کے فیصلے کی خوشخبری سنائی ہے تو یہ صرف میرے لیے نہیں تکبیر کے ہر رکن، اس کے لاکھوں قارئین اور سب سے بڑھ کر برصغیر کے ادبی حلقوں کے لیے فی الحقیقت ایک بڑی خبر ہے۔ اُردو زبان کو انشاء اللہ اس کا ایک گمشدہ کالم نویس دوبارہ مل جائے گا۔''

یہ خط پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، ایک معمولی لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کا یہ انداز مرحوم کی عظمت کی ایک ایسی دلیل ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

مرحوم سے میری آخری بات چیت ان کی شہادت سے صرف پانچ گھنٹے پہلے ہوئی۔ انھوں نے فون کر کے پوچھا کہ کل صبح آپ کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کوئی پروگرام نہیں ہے، میں گھر پر ہی رہوں گا۔ کہنے لگے، میں نو بجے آپ کے ہاں آؤں گا..... لیکن میری بدقسمتی کہ اس روز مرحوم میرے ہاں نہیں آئے، میں ان کے ہاں گیا، ان کی میت کے پاس کھڑے ہو کر ان کا آخری دیدار کیا اور کسی شہید کے چہرے پر ابدی مسکراہٹ کو میں نے پہلی بار دیکھا۔

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ایک کالم ۱۹۹۴ء کی یاد میں

یہ سال جسے ہم نے ابھی ابھی رخصت کیا ہے، اُردو ادب کے حق کے میں خاصا نامبارک ثابت ہوا۔ یہ اپنے ساتھ ایسے ایسے روشن چہروں کو لے گیا جن کی موجودگی سے چراغاں کا سماں ہو تا تھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، رضا ہمدانی، منظور حسین شور، محشر بدایونی، ظہیر کاشمیری، ابو سعید قریشی، احمد داؤد، ساقی جاوید، پروفیسر فروغ احمد اور کئی دوسرے لکھنے والوں کی دائمی مفارقت کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ سال کے اختتام سے صرف پانچ دن پہلے پروین شاکر بھی قافلۂ رفتگاں میں شامل ہو گئیں۔ بقول جمیل الدین عالی، اُردو ادب کا وہ ماہ تمام غروب ہو گیا جسے ایک دن مہر نیم روز بنتا تھا۔ اس سب مرحومین کے لیے ہم مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

جہاں تک اہل ادب کی مجموعی کارکردگی کا تعلق ہے، یہ سال خاصا باثروت رہا۔ لکھنے والوں نے اتنا کچھ لکھا ہے اگر ساری تحریروں کو بوریوں میں بند کر کے ٹھکانے لگانے کی ضرورت پیش آجائے تو ہر شہر کی میونسپل کمیٹی کو اس کام کے لیے اضافی عملہ رکھنا پڑے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۹۴ء میں لکھی گئی غزلوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیگر اصناف ادب میں پیداواری صورتِ حال کس قدر مسرت انگیز ہو گی بشرطیکہ حصولِ مسرت کے دیگر تمام وسائل مسدود ہو گئے ہوں۔

ہم ضرورت کی ہر چیز باہر سے منگواتے ہیں لیکن ادب کی حد تک ہم نہ صرف خود کفیل ہو گئے ہیں بلکہ اس لائق بھی ہیں کہ یہ جنس دوسرے ممالک کو برآمد کر سکیں۔ مگر افسوس اس جنس گراں مایہ کا غیر ممالک میں کوئی خریدار نہیں ہے۔ خریدار تو ملک کے اندر بھی نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود گزشتہ سال کتابیں اس کثرت سے چھپتی رہیں جس طرح اسٹیٹ بینک نوٹ چھاپتا ہے۔ نوٹوں پر

تو گورنر اسٹیٹ بینک کے دستخطوں کے ساتھ یہ ضمانت موجود ہوتی ہے کہ حاملِ ہذا کو نوٹ کی قیمت کے مطابق رقم ادا کی جائے گی لیکن کتابوں پر یہ ضمانت درج نہیں ہوتی کہ ان کی قیمت کے عوض خریدار کو بھی کچھ ملے گا۔ ضمانت کی بجائے کتابیں مصنفین کی تصویروں سے مزین ہوتی ہیں۔ ان تصویروں میں سے بیشتر سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے صاحبانِ تصویر، تصویر کھنچوانے سے کچھ پہلے ضمانت پر رہا ہوئے ہیں۔

۱۹۹۴ء میں کتابوں کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کرتی رہیں جب کہ کتابوں میں شامل مواد سطحِ زمین سے اتنا بھی بلند نہ ہو سکا جتنا سمندر سے ساحلِ سمندر بلند ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے اہلِ قلم تخلیقی سطح پر زمین اور اہلِ زمین کے مسائل سے نبرد آزما رہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب کتابوں کو خریدار نہیں ملتے تو پھر کتابیں کثرت سے کیوں چھپتی ہیں اور ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اس سوال کے پہلے جزو کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تقسیم کار کا نظام مروّج ہے۔ کتابوں کو مصنف یا خریدار میں سے کوئی ایک ہی مل سکتا ہے۔ بیک وقت دونوں اس لیے نہیں مل سکتے کہ کتابیں زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں شامل نہیں۔ چونکہ مصنف کے بغیر کتاب وجود میں نہیں آسکتی، اس لیے مصنف کا دستیاب ہو جانا ہی کافی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتابیں زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں اس لیے شامل نہیں ہیں کہ انھیں پہنا جا سکتا ہے نہ کھایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھیں اینٹوں کی جگہ استعمال کر کے مکان بنا لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کی صورت میں کتنا ہی نایاب مال بازار سے کیوں نہ آجائے گا کبھی توجہ نہیں کرتے۔

کتابیں زیادہ اس لیے چھپتی ہیں کہ ہمارے ملک میں ادیبوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ادیب اس لیے زیادہ ہیں کہ بے روزگاری زیادہ ہے۔ لوگوں کو معقول ذرائع معاش میسر نہیں ہوتے، اس لیے وہ بیکاری و بے روزگاری کا غم غلط کرنے کے لیے غلط کام کرتے ہیں۔ یعنی شاعری اور افسانہ نگاری سے دل بہلاتے ہیں۔ جب کوئی شخص ادیب بن جاتا ہے تو اس کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ مصنف بھی بن جائے۔ لہٰذا وہ قرض لے کر یا تجارتی اداروں سے اشتہار لے کر کتاب شائع کر دیتا ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والی بیشتر کتابیں اس طرح چھپتی ہیں۔

کتابوں کی قیمتیں اس لیے زیادہ رکھی جاتی ہیں کہ انھیں اور کسی وجہ سے نہیں تو ان کی قیمتوں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کی وجہ سے یاد رکھا جائے۔ ایک مرتبہ سو صفحات کی ایک کتاب کی قیمت ڈیڑھ سو روپے دیکھ کر ہم نے اس کے مصنف سے کہا تھا، اچھے وقتوں میں اتنی قیمت میں کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کو بھی خریدا جا سکتا تھا۔ اس کے جواب میں جناب مصنف نے فرمایا تھا، اب کتاب اور مصنف کی قیمتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔

معاف کیجیے ہم نظریاتی بحثوں میں پڑ گئے، حالانکہ ہمارا مقصد ۱۹۹۴ء کے ادب کا جائزہ لینا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اس وقت ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہمارے سامنے رکھے ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس مختصر سے کالم میں اس سب کا ذکر کس طرح کیا جائے۔ استاد لاغر مراد آبادی سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا، آنکھیں بند کر کے کوئی سی دو کتابیں اٹھا لیجیے اور انھیں کے بارے میں کچھ لکھ دیجیے۔ ہم نے عرض کیا، آنکھیں بند کر کے کتابیں لکھی تو جا سکتی ہیں، کالم کے لیے ان کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات انھیں پسند آئی اور فرمایا، تو پھر یوں کیجیے کہ اس سال، سب سے آخر میں جو دو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان پر طبع آزمائی کیجیے۔ یہ بات ہمیں پسند آئی۔

۱۹۹۴ء کے آخری ہفتے میں لاہور کے رسالے "معاصر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا ہے اور سال کے آخری دن نظیر صدیقی کے مجموعۂ کلام "حسرت اظہار" سے ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی ہیں۔ گویا یہ کتاب نہیں ۱۹۹۴ء کے تابوت میں آخری کیل ہے۔ اس تاریخی اہمیت کی وجہ سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ پہلے اسی کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے۔

نظیر صدیقی ایک نقاد اور مزاح نگار کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے نصف درجن مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مزاحیہ مضامین کا بھی ایک مجموعہ "شہرت کی خاطر" کے نام سے مقبول خاص و عام ہو چکا ہے۔ موصوف اپنے مزاحیہ مضامین کو انشائیے کا نام دیتے ہیں تاکہ مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور نہ ہوں۔ اس احتیاط کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر کوئی نقاد، مزاح نگار ہو تو اس کے تنقیدی مضامین کو مزاحیہ مضامین سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اُردو کے بہت سے نقاد مزاح سے کوسوں دور رہتے ہیں لیکن جب وہ تنقید لکھتے ہیں تو یہ دوری قربت میں بدل جاتی ہے۔ نظیر صدیقی کا کمال یہ ہے کہ انشائیوں اور تنقیدوں کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ ان کے انشائیے پڑھ کر ہنسی آتی ہے لیکن تنقیدی مضامین پڑھ کر آنکھیں

نمناک ہو جاتی ہیں۔ یہ نمناکی زیادہ ہنسنے کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہایت دل سوزی اور جگر کاری سے تنقید لکھتے ہیں اور جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں، اور پھر وہ موضوع اس قابل نہیں رہتا کہ کوئی دوسرا اس پر لکھے۔

نظیر صدیقی کلاہ امتیاز میں جو کئی رنگین پر لگے ہوئے ہیں، ان میں ایک پر شاعری کا بھی ہے جو دوسروں کے لیے حیرت کا اور خود ان کے لیے فخر کا سبب ہے۔ "حسرت اظہار" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں نظیر صدیقی نے خود ہی شائع کیا تھا اور اپنے احباب میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس لیے اس کا کچھ زیادہ چرچا نہیں ہوا تھا۔ اب سترہ برس بعد موصوف نے دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اضافوں کے باوجود اس کی ضخامت محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کے پمفلٹوں سے زیادہ نہیں ہے۔ تاہم کلام کی مقدار کو نہیں، معیار کو دیکھا جائے تو یہ خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے تین چار نہایت عمدہ شعر کہے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

اس کے چہرے پر شعاعیں پڑ رہی تھیں اس طرح
روپ بھی اچھا لگا اور دھوپ بھی اچھی لگی

نظیر صدیقی نے دیباچے میں لکھا ہے، "کسی شاعر کے صرف ایک مصرعے یا صرف ایک شعر کا بھی زندہ رہ جانا اس کی انتہائی خوش نصیبی ہے۔" ہم جناب موصوف کو تہِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے جو زندہ رہنے والے شعر کہے ہیں ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک شعر ہم نے اوپر درج کر دیا ہے، باقی دو تین شعر تلاش کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ جب یہ دستیاب ہو جائیں گے تو ہم خط یا فون کے ذریعے موصوف کو اطلاع کر دیں گے۔ کالم میں درج اس لیے نہیں کریں گے کہ اگر تمام اچھے شعر ہم نے نقل کر دیے تو مجموعے میں پڑھنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔

عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد جو حیرت انگیز کارنامے انجام دے رہے ہیں، ان کی داد دیتے وقت دشواری یہ پیدا ہوتی ہے کہ آخر کس بات کی داد دی جائے۔ شاعری، کالم نگاری، ڈراما نویسی، سفرنگاری، کونسا میدان ہے جس میں ان دونوں نے جولانیِ طبع کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ اگر داد دیتے ہوئے بھی انتہائی بخل سے بھی کام لیا جائے تو کم از کم یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ کالم نگاری میں عطاء کا اور شاعری میں امجد کا کوئی حریف نہیں ہے۔ باقی میدانوں میں بھی یہی دونوں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

ایک کالم ان دونوں نے مشترکہ طور پر شروع کر رکھا ہے اور وہ ہے رسالہ "معاصر"۔ جس کا چوتھا شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ۱۹۹۴ء میں یوں تو کئی نئے اور پرانے رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن "معاصر" ان سب سے بازی لے گیا ہے۔ اس میں نہ صرف دورِ حاضر کے متعدد اہم ترین لکھنے والوں کی نگارشات شامل ہیں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی یہ نہایت اہم تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ہم ایسی چند ہی تحریروں کا ذکر کر سکتے ہیں جن میں سرفہرست سعادت حسن منٹو کا شخصی خاکہ ہے جو احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے۔ اس خاکے سے منٹو کے بارے میں بعض ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو پہلے کبھی کسی نے نہیں لکھیں۔ منٹو کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے ایک رندلاابالی کا تصور ذہن میں آتا ہے، لیکن اس خاکے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنظیم و ترتیب کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا ایک مخلص، بے ریا، وضع دار، باکردار، زندہ دل، ہمدرد اور دوست نواز انسان تھے۔

اخلاق احمد دہلوی کا انتقال چند سال پہلے ہوا تھا۔ ہمیں یاد نہیں ان کے بارے میں کسی نے کچھ لکھا ہو۔ حمید اختر پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اخلاق احمد دہلوی کی شخصیت کو موضوع بنایا ہے اور ایک خوبصورت خاکہ لکھا ہے۔

"معاصر" کا سب سے اہم حصہ پروین شاکر کا خصوصی مطالعہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آفتاب احمد اور خالدہ حسین نے پروین کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر فکر انگیز مضامین لکھے ہیں۔ پروین کا بہت سا تازہ کلام بھی شائع کیا جو اب آخری کلام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس رسالے کا ایک دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں احمد ندیم قاسمی، ساقی فاروقی، اور مشفق خواجہ کی مراسلت شائع کی گئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ساقی فاروقی نے قاسمی صاحب کو ایک غزل بھیجی جس کے بعض مصرعوں پر انھیں شک ہوا کہ یہ بحر سے خارج ہیں۔ انھوں نے یہ غزل مشفق خواجہ کو بھیجی کہ وہ اس کے بارے میں رائے دیں۔ مشفق خواجہ نے قاسمی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ قاسمی صاحب نے یہ رائے ساقی تک پہنچائی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک نئی بحر ایجاد کی ہے۔ مشفق خواجہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ کیسی نئی بحر ہے جس کے آدھے سے زیادہ مصرعے ایک پرانی اور معروف بحر میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ بحث آگے بڑھی تو

ساقی نے اپنے خطوں میں لطیفوں اور چٹکلوں کا ایک سلسلہ شروع کر کے بحث کو ایک مزاحیہ رنگ دے دیا۔ ساقی کے خطوط ان کی شگفتہ نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اس خط و کتابت کا ایک نمونہ یہ ہے۔ ساقی نے اپنی ایجاد کردہ بحر کے مترنم ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اسے میں نے اپنے اندر کی موسیقی سے آزمایا ہے۔ مشفق خواجہ نے جواب دیا، "تمہارے اندر کی موسیقی کچھ خبث باطن قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے جو صرف تمہارے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے، ان لوگوں کے لیے نہیں جنھوں نے باہر کی موسیقی بھی سنی ہے۔"

www.KITAABISTAN.com

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

حاصلِ مطالعہ-شرمندگی!

پچھلے کچھ دنوں سے شہر میں خان ظفر افغانی کی کتاب ''سخن امروز'' کا بہت چرچا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس کی تقریب رونمائی میں طاہر مسعود نے جو مضمون پڑھا تھا، وہ اس قسم کی تقاریب کی روایات کے خلاف تھا۔ انہوں نے کتاب کی تعریف کرنے کی بجائے اس کے عیوب کی نشاندہی کی۔ طاہر مسعود کی حق گوئی کی تعریف کئی لوگوں کی زبانی سننے میں آئی تو خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں حق گوئی کا رجحان اس حد تک عام ہوگیا ہے کہ طاہر مسعود کا شمار بھی حق گوؤں میں ہونے لگا ہے۔ حق گوئی سے ہمیں بھی نظریاتی دلچسپی ہے، اس لیے ہم نے طاہر مسعود کا مضمون منگوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ معاملہ حق گوئی کا نہیں، سہل پسندی اور تن آسانی کا ہے۔ مضمون انھوں نے عجلت میں لکھا ہے، اس لیے انھیں صرف کتاب کے عیب نظر آئے۔ اگر وہ سال دو سال صرف کر کے کتاب کا مطالعہ محنت اور توجہ سے کرتے تو ہمیں یقین ہے کہ انھیں نہ صرف کتاب کی بے شمار خوبیوں کا علم ہو جاتا بلکہ عجلت میں انھوں نے جو عیب تلاش کیے ہیں وہ بھی خوبیوں میں تبدیل ہو جاتے۔

''سخن امروز'' بائیس ادیبوں کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ طاہر مسعود کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ جن کے انٹرویو لیے گئے ہیں، ان میں صفِ اوّل کے ادیب نہ ہونے برابر ہیں۔ ایسے ادیبوں کے انٹرویو لینے کا کیا فائدہ جن کا ادب میں کوئی نام متعین نہ ہوا ہو۔ اس اعتراض کا مسکت جواب تقریب رونمائی کے صدر جمیل الدین عالی نے بروقت دے دیا کہ ادب میں کسی کا اہم یا غیر اہم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آج جس ادیب کو ہم غیر اہم کہہ رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ مستقبل کا اہم ادیب ہو۔ عالی صاحب نے اپنی دلیل کو مزید وزنی بنانے کے لیے فرمایا، سائنس دان تو چوہوں،

خرگوشوں اور کیڑوں تک پر ریسرچ کرتے ہیں تو ادب میں اہم اور غیر اہم کا سوال کیوں اٹھایا جائے۔ اس بات سے بعض کم فہموں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عالی صاحب ''ریسرچ'' اور ''انٹرویو'' کو ہم معنی الفاظ سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مؤلف نے ادیبوں پر ریسرچ نہیں کی، ان کے انٹرویو لیے ہیں۔ اگر وہ سائنس دان ہوتے اور ریسرچ کرتے تو اس کے نتیجے میں ایک نہایت سنجیدہ تحقیقی کتاب وجود میں آتی جب کہ موجودہ صورت میں یہ ایک دلچسپ بلکہ بڑی حد تک مزاحیہ کتاب ہے جسے پڑھتے ہوئے ہی نہیں، انٹرویو دینے والے ادیبوں کی تصویریں دیکھتے ہوئے بھی ہنسی آتی ہے۔

عالی صاحب کی اس بات سے بھی ہمیں صد فیصد اتفاق ہوتا ہے کہ آج ہم جس ادیب کو غیر اہم کہہ رہے ہیں، ہوسکتا ہے وہ مستقبل کا اہم ادیب ہو۔ اس فکر انگیز نکتے کی وضاحت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ بعض ادیبوں کا غیر اہم ہونا ہی ان کی اہمیت کا سبب بن جاتا ہے۔ آج سے پچاس سال بعد جب کوئی محقق آج کے گمنام ادیبوں اور شاعروں پر تحقیق کرے گا تو اسے زیرِ نظر کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتاب اہم ہے۔ گویا کتاب اس لیے اہم ہے کہ اس میں جن ادیبوں کے انٹرویو شامل ہیں، وہ پچاس سال بعد کے محقق کے نزدیک اپنی گمنامی کی وجہ سے اہم ہوں گے۔ طاہر مسعود کی رائے پچاس سال کے محقق کی رائے کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ خود موصوف بھی اس محقق کی کوششوں سے گمنامی کے حجرے سے باہر نکلیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح آج وہ ''سخن امروز'' پر مضمون لکھ کر نیک نامی کے دائرے سے خارج ہوئے ہیں۔

طاہر مسعود نے کتاب پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اس میں ایسی تصویریں خاصی بڑی تعداد میں ہیں جن میں کتاب کے مؤلف مختلف ادیبوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ یہ صریحاً غلط بیانی ہے۔ تصویریں خاصی بڑی تعداد میں نہیں ہیں۔ ہم نے گنتی کی ہے، صرف ۳۵ تصویروں میں مؤلف موجود ہیں۔ پونے چار سو صفحات کی کتاب میں ۳۵ تصویریں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ طاہر مسعود کو معلوم ہونا چاہیے کہ نمک کے بغیر آٹا ہی نہیں، کتاب بھی بے مزہ ہوتی ہے۔ تصویروں کی شمولیت کا یہ فائدہ بھی ہے کہ کتاب سے ناخواندہ لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ ناخواندوں کے لیے تصویری کتابیں ہی شائع کی جاتی ہیں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

طاہر مسعود کے باقی اعتراضات بھی خاصے کمزور ہیں، ان کی تردید میں ہم اپنا وقت اور موصوف کا علم ضائع نہیں کرنا چاہتے کہ یہ دونوں چیزیں ہم دونوں کے پاس محدود مقدار میں ہیں، لہٰذا ہم کتاب کی کچھ ایسی خوبیوں کی طرف اشارہ کریں گے جن کی بناء پر یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر اس شخص کی نظر سے گزرے گی جس کا انٹرویو اس میں شامل نہیں ہے۔ جن کے انٹرویو اس میں شامل ہیں، انھیں یہ کتاب اس لیے پڑھنی چاہیے کہ بعض حساس لوگ اس وقت سخت شرمندہ ہوتے ہیں جب ان کی کہی ہوئی باتیں خود انھیں کو سننی یا پڑھنی پڑتی ہیں۔ دوسروں کے شرمندہ ہونے میں کوئی حرج نہیں کہ آج کل شرمندگی ہی حاصل مطالعہ ہوتی ہے۔

سب سے پہلی چیز جس نے ہمیں متاثر کیا وہ مؤلف کی جرأت ہے۔ انھوں نے بعض ادیبوں سے ایسے ایسے سوالات کیے ہیں کہ ان کا جواب اگر زبان کی بجائے کلاشنکوف سے بھی دیا جاتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مثلاً انھوں نے ایک شاعر سے یہ پوچھا، ''آپ کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ آپ شہرت کے حصول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ اس رائے کو تسلیم کرتے ہیں؟'' جناب شاعر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، ''جی ہاں ہم تسلیم کرتے ہیں..... اس میں کیا برائی ہے..... سقراط جیسا شخص سڑکوں اور چوراہوں پر مجمع لگایا کرتا تھا..... چونکہ ہم سقراط نہیں ہیں لہٰذا ہم نے مجمع نہیں لگایا، دوسروں کے مجمع میں داخل ہو جاتے ہیں۔'' یہ ان صاحب کی کسرِ نفسی ہے ورنہ ان میں اور سقراط میں بس تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ سقراط کے پیالے میں زہر تھا اور ان کے پیالے میں شہرت۔ تاثیر کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ بہر حال ہم ان شاعر محترم کو مشورہ دیں گے کہ دوسروں کے مجمع میں داخل ہوتے وقت ذرا احتیاط سے کام لیا کریں کیونکہ مجموں میں ہاتھ کی صفائی دکھانے والے بھی ہوتے ہیں۔ اگر ان کا شہرت بھرا پیالہ کسی اور نے پی لیا تو پھر انھیں وہی کچھ کرنا پڑے گا جو یاس یگانہ نے کیا تھا۔

پیالہ خالی اٹھا کر لگایا منھ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

اس کتاب میں بعض اہلِ قلم نے ایسی مزے مزے کی باتیں کی ہیں کہ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اُردو میں ایسی دلچسپ کتابیں کم ہی لکھی گئی ہیں اور اسی بناء پر ہم نے اس کا شمار مزاحیہ کتابوں میں کیا ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے نہیں ہے جو سردیوں کے

دنوں میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر پڑھی جاتی ہیں تاکہ آتشدان کی آگ کم ہونے لگے تو اس میں مزید ایندھن ڈالا جا سکے، بلکہ ان کتابوں میں سے ہے جو آتشِ شوق کو تیز سے تیز تر کرتی ہیں اور ان کے مطالعے سے دل و دماغ فرحت محسوس کرتے ہیں۔

اس میں جو دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے جو قتیل شفائی نے بیان کیا ہے۔ انھوں نے بمبئی میں ایک رات ندا فاضلی کے ساتھ گزاری۔ ندا نشے میں تھے اور اس عالم میں قتیل شفائی کی خوب تعریف کرتے رہے۔ قتیل نے ان سے کہا، جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ لکھ کر دے دو۔ ندا نے وعدہ کیا کہ وہ صبح لکھ دیں گے۔ صبح ہوئی تو ندا کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ ان سے ایفائے وعدہ کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا، ''میں کیوں لکھوں؟''

ہمارا یہ کالم اگر ندا فاضلی کی نظر سے گزرے تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ وعدہ کر کے مکر جانا بری بات ہے۔ قتیل شفائی ہمارے بزرگ شاعر ہیں، ان کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ آپ نے نشے کی حالت میں ان کی شاعری کی جو تعریف کی تھی، اگر آپ اسے عالم ہوش میں نہیں لکھ سکتے تو نشے کی حالت ہی میں لکھ دیجیے۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہوگا کہ آپ کا نشہ بھی سند بن جائے گا۔

قتیل شفائی کو ندا فاضلی ہی سے نہیں، اُردو کے عام نقادوں سے بھی شکایت ہے کہ وہ انھیں نظر انداز کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں، ''آپ مجھے تنقید نگاروں کی تحریروں میں کم کم پائیں گے۔ میں تنقید سے مطمئن نہیں، اس لیے کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا۔'' عجیب بے اطمینانی کا دور ہے، نقاد قتیل شفائی کی شاعری سے مطمئن نہیں، قتیل شفائی نقادوں سے مطمئن نہیں، اور پڑھنے والے دونوں سے غیر مطمئن ہیں۔

احمد فراز سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنی مادری زبان پشتو میں شاعری کیوں نہیں کی؟ انھوں نے جواب دیا، ''وہاں اتنے بڑے شاعر تھے کہ میں گھبرا گیا۔ غنی صاحب، حمزہ شنواری، اجمل خٹک۔'' بات بڑی معقول ہے۔ اُردو میں فیض اور راشد سمیت کوئی ڈھنگ کا شاعر ہی نہیں تھا۔ احمد فراز نے اچھا کیا کہ اس خلا کو پُر کر دیا۔

فراز کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ وہ فیض کے انداز میں شعر کہتے اور سگریٹ پیتے ہیں، اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ سوالوں کے جواب بھی فیض ہی کے انداز میں دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایوب

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مرزا کی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ فیض سے پوچھا گیا کہ انھوں نے پنجابی میں شاعری کیوں نہیں کی؟ انھوں نے جواب دیا، '' اگر ہم عمر بھر کوشش کریں تو بلھے شاہ اور وارث شاہ جیسا ایک شعر نہیں کہہ سکتے، اس لیے پنجابی زبان میں شعر کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

اگر فراز نے فیض کے کسی شعر کا مضمون اڑا لیا ہوتا تو اسے سرقے یا توارد کا نام دیا جا سکتا تھا، گفتگو کی یکسانیت کے لیے سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ بڑے لوگ یکساں طور پر سوچتے ہیں اور وہ بھی پشتو اور پنجابی کے بجائے اردو میں۔

اس کتاب میں بعض اچھے اچھے شعر بھی پڑھنے کو ملتے ہیں مثلاً پروفیسر شور علیگ مرحوم جب نویں جماعت کے طالب علم تھے تو انھوں نے پہلا شعر یہ کہا تھا۔

نظر اس کی آخر کبھی تو پڑے گی
غزل روز کھڑکی سے پھینکا کریں گے

آج کے شاعروں کو بھی اس پر عمل کرنا چاہیے، بشرطیکہ کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہو۔

ڈاکٹر سید دلدار علی فرمان فتحپوری کی شادی ہوئی تو ان کے بڑے بھائی کی طرف سے دعوت نامہ جاری کیا گیا۔ اس میں یہ شعر لکھا تھا۔

بحمدللہ پیہم سن رہا ہوں نغمۂ شادی
میاں دلدار علی فرمان کی ہے خانہ آبادی

اگرچہ اس مبارک تقریب کی اطلاع ہمیں خاصی تاخیر سے ملی ہے تاہم دیر آید درست آید کے مصداق ہم فرمان صاحب کو تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

شوکت صدیقی نے اپنے انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کو ان کی کتاب ''چراغ تلے'' پر گلڈ کا ادبی انعام نہ ملا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ شوکت صاحب کو آدھی بات صحیح یاد رہی، یوسفی صاحب ناراض ضرور ہوئے تھے لیکن اس وقت جب ان کی کتاب ''خاکم بدہن'' پر گلڈ کا انعام دیا گیا تھا۔ ناراض ہونے کی وجہ یہ تھی کہ سفید چادر پر چھوٹا سا دھبا بھی ہو تو وہ اچھا نہیں لگتا۔

آخر میں ہمیں ایک اہم مسئلے کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان تمام ادیبوں کے سال ہائے پیدائش بتائے گئے ہیں جن کے انٹرویو اس میں شامل ہیں، لیکن سحر انصاری کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ پچاس سال بعد جب کوئی محقق اس کتاب کے حوالے

سے دادِ تحقیق دے گا تو اسے سحر انصاری کا سال پیدائش معلوم کرنے میں دقت ہوگی۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں خاصی ہنگامہ آرائی ہو چکی ہے، مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ سحر انصاری کے حوالے سے بھی کوئی تحقیقی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو۔ ہم نے یہ مسئلہ استاد لاغر مراد آبادی کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ سحر انصاری کے انٹرویو میں ایسے داخلی شواہد موجود ہیں جن سے ان کا سال پیدائش متعین کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس اجمال کی تفصیل چاہی تو انھوں نے فرمایا، ''سحر انصاری نے بتایا ہے کہ ان کے گھر میں ۲۳ ہزار کتابیں اور چھ ہزار رسالے ہیں۔ یہ ۲۹ ہزار مطبوعات انھوں نے پڑھ رکھی ہیں۔ اگر فی کتاب اوسط صفحات تین سو صفحات ہوں تو صفحات کی مجموعی تعداد ستاسی لاکھ ہوتی ہے۔ سحر انصاری بے حد مصروف آدمی ہیں۔ شعر کہتے ہیں، تنقید لکھتے ہیں، یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، آئے دن ادبی جلوسوں میں شرکت کرتے ہیں، ملک میں اور ملک سے باہر سیر و سیاحت کے لئے بھی جاتے رہتے ہیں، اتنی مصروفیات کے باوجود اگر وہ ہر روز سو صفحات کا مطالعہ بھی کر لیتے ہوں تو ستاسی لاکھ صفحات کے مطالعے کے لیے ۲۳۸ برس کی مدت درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ انٹرویو دیتے وقت ان کی عمر کم از کم ۲۳۸ برس ضرور ہوگی۔ اس حساب سے ان کا سال پیدائش متعین کیا جا سکتا ہے۔''

ہمارا تخمینہ تھا کہ سحر انصاری کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہے لیکن استاد لاغر مراد آبادی کے حساب کے مطابق تو وہ ماشاءاللہ گزشتہ ڈھائی صدیوں کی تاریخ کے عینی شاہد نکلے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ مزید ۲۹ ہزار کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ اگلی ڈھائی صدیوں کی تاریخ بھی انھی کے سامنے بنے اور بگڑے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اعزازی ڈگری

احمد فراز کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری کیا ملی، چاروں طرف کھلبلی مچ گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی اَن ہونی بات ہوگئی ہو۔ جسے دیکھیے اس موضوع پر گفتگو کر رہا ہے اور اسی مصرع طرح پر غزل کہہ رہا ہے۔ کوئی اسے قربِ قیامت کی نشانی قرار دیتا ہے اور کوئی قربِ حکومت کی۔

احمد فراز کو اعزازی ڈگری ملی ہے تو اس پر ادیبوں کو ناخوش نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ سوچ کر خوش ہونا چاہیے کہ آج ایک کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے تو کل دوسروں کی باری بھی آئے گی۔ حکومت بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ادیبوں کی تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ البتہ ہم یہ مشورہ دیں گے کہ اس نیک کام کا آغاز ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے نہ کیا جائے۔ پہلے مرحلے میں میٹرک کے اعزازی سرٹیفکیٹ تقسیم کیے جائیں، پھر بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دی جائیں، اور آخر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تقسیم کی جائیں۔ جب ادیب درجہ بدرجہ تعلیمی مراحل طے کریں گے تو ان میں تعلیمی قابلیت بھی (اعزازی ہی سہی) پیدا ہوگی اور اس طرح ان کی تخلیقات اس اعلیٰ ادبی معیار کی حامل ہو جائیں گی جس تک پہنچنا تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے ممکن نہیں۔

ادیب اپنی ناخوشی کا اظہار طرح طرح سے کر رہے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ کراچی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، اہلِ شہر زندگی سے بیزار ہیں اور حکومت کو اٹھکیلیاں سوجھی ہوئی ہیں۔ بھلا یہ کوئی موقع تھا کہ احمد فراز کو کراچی یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری دی جاتی۔ احمد فراز نے کون سی کراچی کی خدمت کی ہے یا کراچی کی تباہی پر کوئی ڈھنگ کی چیز لکھی ہے جو اسے نوازا جاتا۔ اگر نوازنا ہی تھا تو اسلام آباد اور صوبہ سرحد میں یونیورسٹیوں کی کیا کمی تھی، انھیں کو اس کارِ خیر کے لیے استعمال کیا جاتا۔ علامہ اقبال یونیورسٹی ڈاک کے ذریعے ڈگریاں تقسیم

کرتی ہے، وہیں سے ایک رجسٹری بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ احمد فراز کو بھجوا دی جاتی۔

ہم نے یہ سب باتیں نقلِ کفر کفر نباشد کے مصداق بیان کی ہیں، ورنہ ہمیں ان سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ کراچی میں اگر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہر کی تعلیمی سرگرمیاں ختم کر دی جائیں۔ ہمارے سامنے نیرو کی مثال موجود ہے، جب روم جل رہا تھا تو اس نے بانسری بجا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ کیسے بھی کٹھن حالات ہوں ثقافتی سرگرمیاں معطل نہیں کی جا سکتیں۔ کراچی یونیورسٹی نے گورنر ہاؤس میں خصوصی کانووکیشن منعقد کر کے اور احمد فراز کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کر کے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ شہر میں انسان مر رہے ہیں تو کیا ہوا، تعلیمی ادارے تو زندہ ہیں۔ انسانوں کا کیا ہے، وہ تو قتل و غارت کے بغیر بھی مرتے رہتے ہیں کیونکہ موت ہر انسان کا مقدر ہے۔ مرنے والوں کی خاطر زندہ لوگوں کی عزت افزائی کا کام تو نہیں روکا جا سکتا۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ احمد فراز نے کراچی کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اس لیے اسے کراچی یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس معاملے کو پورے پاکستان کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ احمد فراز نے آمریت کے دور میں آمریت کے خلاف نظمیں لکھیں، کئی سال تک خود عائد کردہ جلاوطنی کا دکھ جھیلا اور دنیا بھر میں مشاعرے پڑھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت جب پہلی مرتبہ قائم ہوئی تو تب کہیں جا کر بے چارے کو سکھ کا سانس لینے کا موقع ملا۔ اسے اکادمی ادبیات کا چیئرمین مقرر کیا گیا تھا مگر یہ سکھ عارضی تھا۔ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے وزیرِ تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ نے اسے برطرف کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اس طوطی باغِ سخن کو ایک مرتبہ پھر مزاحمتی شاعری کی ناؤ کھینی پڑی۔ جس شخص نے نامساعد حالات ہی میں نہیں مساعد حالات میں بھی دکھ اٹھائے ہوں، اس کی قدر کرنا چاہیے۔ کراچی یونیورسٹی نے اگر اعزازی ڈگری دی ہے تو اس پر کوئی احسان نہیں کیا، احسان تو احمد فراز کا ہے کہ اس نے قتل و غارت گری کے دوران کراچی آ کر یہ ڈگری قبول کی۔ ہاں کراچی یونیورسٹی کو اس کی داد دی جا سکتی ہے کہ وہ اب تک ڈگریاں دے کر بے روزگار نوجوان پیدا کر رہی تھی، اب اس نے پہلی مرتبہ ایک برسرِ روزگار نوجوان کو ڈگری دی ہے۔

احمد فراز کو ڈگری دیتے وقت اس کے جو فضائل بیان کیے گئے، ان میں یہ بھی تھا کہ اس سریر

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

آرائے اقلیم سخن نے مارشل لاء حکومت کے دوران مزاحمتی ادب تخلیق کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے غیر مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے ایک شاعر نے کہا، فراز کا کمال یہی نہیں ہے کہ اس نے مزاحمتی ادب تخلیق کیا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس نے جس آمرانہ حکومت کے خلاف لکھا، اسی کے وزیر داخلہ کے دست مبارک سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری لی کیونکہ یہی وزیر داخلہ اب سندھ کے گورنر اور کراچی یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔

یہ بات طنزاً کہی گئی ہے، لیکن یہ طنز کا نہیں، خوشی کا موقع ہے کہ دورِ آمریت کی ایک یادگار (سابق وزیر داخلہ) نے اسی دور کی ایک دوسری یادگار (سابق مزاحمتی شاعر) کی برسرِ عام قدر افزائی کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ ماضی کے وقتی اختلافات مستقبل کے خوشگوار مراسم کی راہ میں مزاحمتی کردار ادا نہیں کر سکتے۔

ہمارے ملک میں جعلی ڈگریوں کا کاروبار ایک عرصے سے جاری ہے۔ آج تک کسی ادیب نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اب اعزازی ڈگریوں کا کاروبار جاری ہوا ہے تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آ رہی ہیں۔ ایک اعتراض یہ کیا جا رہا ہے کہ حکومت عہدوں اور اعزازات کی تقسیم میں اس روایتی اندھے کا کردار کر رہی ہے جو ریوڑیاں بانٹتا ہے تو ہیر پھیر اپنوں ہی کو دیتا ہے۔ احمد فراز کو دوسروں سے کچھ زیادہ ہی ریوڑیاں مل رہی ہیں۔ پہلے اسے نیشنل بک فاؤنڈیشن کا چیئرمین بنایا گیا اور اب ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی گئی۔

معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر حکومت اپنوں ہی میں ریوڑیاں بانٹتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ریوڑیاں ایسے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں جن کے دندان آز کمزور ہوں کیونکہ ریوڑیاں چبانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر حکومت ہی بہتر طور پر فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو کیا دینا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ کون حزب اختلاف کے شیخ رشید کی طرح قید بامشقت کے لائق ہے اور کون احمد فراز کی طرح کسی ادارے کی سربراہی بے مشقت کا مستحق ہے۔

احمد فراز کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کا چیئرمین کیا گیا تھا تو اس پر بھی بہت چہ میگوئیاں ہوئی تھیں، اور یہ کہا گیا تھا، یہ علمی ادارہ ہے، اس کی سربراہی پر ایک غزل بلب اور دست بدل شاعر کو فائز کرنا ادارے کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی اعتراض کو رفع کرنے کے لیے اب احمد فراز کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی ہے تاکہ معترضین کو معلوم ہو کہ اس ادارے کا چیئرمین صرف شاعر نہیں

ہے، اس کے پاس سب سے بڑی تعلیمی سند بھی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ سند معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہوگی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کے زخم کچھ اور ہرے ہو گئے ہیں۔ کاش معترضین کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی کی ترقی درجات سے ناخوش ہونا اتنا ہی برا ہے جتنا چور دروازے سے ترقی کے مرحلے طے کرنا۔ احمد فراز کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ اس نے عشق اور ملازمت دونوں میں ترقی درجات کے مرحلے کھلے بندوں طے کیے اور حقائق آنکھوں میں آنکھیں بلکہ گلے میں بانہیں ڈال کر یہ ثابت کر دکھایا کہ شاعری اور دنیاداری، دونوں میں اس کا اسلوب منفرد ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ احمد فراز کو ڈاکٹر آف لٹریچر بنانے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا، وہ سراسر ناپسندیدہ ہے۔ ایک تو یونیورسٹی سنڈیکیٹ سے منظوری حاصل نہیں کی گئی، دوسرے ڈگری کی تفویض کے لیے یونیورسٹی کیمپس کی بجائے گورنر ہاؤس میں خصوصی کانووکیشن منعقد کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کلھیا میں گڑ پھوڑا گیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی اکثریت کو اور تمام طالب علموں کو اس کانووکیشن سے لاعلم رکھا گیا۔

ہمیں ان اعتراضات سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ جہاں تک اساتذہ اور طلبہ کے "لاعلم" رہنے کا تعلق ہے تو یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ یہ یونیورسٹی کی پرانی روایت ہے۔ سال میں چھ مہینے مختلف قسم کی تعطیلات کی وجہ سے یونیورسٹی بند رہتی ہے۔ باقی چھ مہینوں میں کبھی طلبہ ہڑتال کرتے ہیں اور کبھی اساتذہ۔ کبھی رینجرز سے تھڑے کی وجہ سے اور کبھی شہر کے ہنگاموں کے سبب کاروبارِ علم معطل رہتا ہے۔ ایسی لاعلمی کی فضا میں اگر اساتذہ اور طلبہ کو احمد فراز کے اعزاز سے لاعلم رکھا گیا تو کون سی بے جا بات ہوئی۔ جہاں پہلے ہی بہت سی لاعلمی ہے، وہاں تھوڑی سی اور سہی۔

اگر یہ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوتا تو اس کا امکان تھا کہ بعض اراکین اپنی عادت کے مطابق بلاوجہ مخالفت کرتے اور یہ تجویز نامنظور ہو جاتی۔ اوپر والوں کے فیصلے اس لئے نہیں ہوتے کہ نامنظور ہو جائیں۔ انھیں ہر حالت میں نافذ ہونا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو کام سنڈیکیٹ کی منظوری کے بغیر انجام پا سکتا ہو، اس کے لئے منظوری لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

جہاں تک گورنر ہاؤس میں کانووکیشن منعقد کرنے کا تعلق ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماضی میں کئی مرتبہ غیر ملکی سربراہان مملکت کو ایوان صدر یا گورنر ہاؤس میں کانووکیشن منعقد کر کے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اعزازی ڈگریاں دی گئی ہیں۔ احمد فراز بھی مملکت سخن کا بے تاج بادشاہ ہے، اگر اس کے لیے گورنر ہاؤس کو مشاعرہ گاہ بنا دیا گیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

گورنر ہاؤس کے حوالے سے گھیا میں گڑ پھوڑنے کا محاورہ استعمال کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترضین زبان و بیان کے معاملے میں خاصے غیر محتاط ہیں۔ یہ محاورہ ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جب کوئی کام چھپا کر راز داری کے ساتھ کیا جائے۔ احمد فراز کو اعزازی ڈگری دینا کوئی غلط کام نہیں تھا جو چھپا کر کیا جاتا۔ جو کچھ ہوا ہے علی الاعلان ہوا ہے۔ اس لیے یہاں معترضین کو ڈنکے کی چوٹ والا محاورہ استعمال کرنا چاہیے تھا، ویسے ہی جیسے اس مصرعے میں کسی شاعر نے استعمال کیا ہے:

ڈنکے کی چوٹ عرش پہ شور فغاں گیا

اب ڈنکا بجانے کا رواج نہیں رہا لیکن محاورتاً بجتا رہتا ہے، جیسے آج کل احمد فراز کا ڈنکا بج رہا ہے۔ وہ میر انیس کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

ڈنکا بجے جہاں میں نہ کیوں دم بدم مرا
ہے معرکے میں رستم دستاں قلم مرا

احمد فراز کا قلم یقیناً مزاحمتی ادب کا رستم ہے۔ فردوسی کے شاہ نامے کی بات اور تھی، آجکل ایسے رستم بھی نظر آجائیں تو انھیں غنیمت سمجھنا چاہیے۔

مخالفین نے ۱۵ر فروری کے اخبار جنگ میں ایک خبر چھپوائی ہے جس میں کہا گیا ہے، ''اگر اس اعزازی ڈگری کی سنڈیکیٹ سے منظوری حاصل کر لی جاتی تو اس سے سنڈیکیٹ اور ڈگری کے وقار میں اضافہ ہو جاتا۔'' ہمارا ناقص رائے میں ڈگری کے وقار میں تو اسی وقت اضافہ ہو گیا جب یہ ضیاء الحق دور کے وزیر داخلہ کے ہاتھوں سے اسی دور کے مزاحمتی شاعر کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس ڈگری کو سنڈیکیٹ کے حوالے سے مزید کسی وقار کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک سنڈیکیٹ کے وقار میں اضافے کا تعلق ہے تو اس کی گنجائش اب بھی موجود ہے۔ سنڈیکیٹ کے اگلے اجلاس میں اس مضمون کی قرارداد منظور کی جا سکتی ہے کہ احمد فراز کو اعزازی ڈگری دے کر سنڈیکیٹ کے وقار میں اضافہ کیا گیا ہے، اس کے لیے سنڈیکیٹ کے اراکین چانسلر اور وائس چانسلر کے بے حد ممنون ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ مزاحمتی ادب لکھنے والے کئی اور ادیبوں (مثلاً کشور ناہید اور انور سجاد وغیرہ) کو بھی اعزازی ڈگریاں دی جائیں گی۔ سنڈیکیٹ کو ابھی سے ان کو ڈگریاں دینے کی سفارش کر دینی چاہیے تاکہ بعد میں یہ نہ کہا جائے کہ سنڈیکیٹ کی منظوری کے بغیر ڈگریاں یا ریوڑیاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔

www.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ادبی خیرات

چھ سات مہینے پہلے ہم نے اپنے ایک کالم میں غالب کے شاگرد میاں داد خاں سیاح کا ذکر کیا تھا۔ یہ وہی سیاح ہیں جن کا یہ شعر.....

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ سیاح کو غالب نے "سیف الحق" کا خطاب دیا تھا اور اپنی ایک کتاب "لطائف غیبی" ان کے نام سے چھاپی تھی۔ استاد شاگردوں کو غزلیں تو لکھ کر دیتے ہی ہیں اور آج بھی ادبی خیرات کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے، لیکن شاگرد کے نام سے کتاب لکھنے کا یہ واقعہ اُردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ اس کے ساٹھ ستر برس بعد کا ہے جب شاد عظیم آبادی نے اپنی سوانح عمری لکھ کر اپنے شاگرد مسلم عظیم آبادی کو دی کہ آپ اپنے نام سے چھپوالو۔ یہ صاحب کچھ زیادہ سعادت مند شاگرد نہ تھے، انھوں نے شاد کی وفات کے بعد "عطائے تو بہ لقائے تو" کے مصداق یہ سوانح عمری استاد ہی کے نام سے چھپوادی اور کتاب کا نام رکھا "شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔"

"لطائف غیبی" پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں سیاح کے نام سے چھپی تھی۔ غالب کی وفات کے بہت عرصہ بعد جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ غالب ہی کی تصنیف ہے تو اسے چند مرتبہ غالب کی نثری تحریروں کے مجموعوں میں شامل کیا گیا، لیکن الگ کتابی صورت میں غالب کے نام سے یہ کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اب پہلی اشاعت کے پورے ایک سو تیس برس بعد اصل مصنف یعنی غالب کے نام سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اسے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب غالب پر جان دیتے ہیں، لیکن وہ ان جان دینے والوں میں سے نہیں ہیں جو حساب کتاب برابر کر دیتے ہیں۔ اس جملے سے محظوظ

ہونے کے لیے ایک واقعے کا جاننا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک نقاد مصحفی کو بہت پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ اس پر انھوں نے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ یہ کتاب لے کر وہ علامہ نیاز فتح پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ کہہ کر پیش کی کہ میں مصحفی پر جان دیتا ہوں۔ علامہ نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا: "آپ نے حساب کتاب برابر کر دیا یعنی مصحفی کی جان لے لی۔"

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صحیح معنوں میں غالب شناس ہیں۔ غالب پر انھوں نے جتنی اور جیسی تحقیق کی ہے، اس کی کم از کم موجودہ دور میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ "لطائف غیبی" کا جو ایڈیشن انھوں نے شائع کیا ہے، اس پر انہوں نے ایک جامع مقدمہ لکھا ہے جس میں بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ غالب ہی کی تصنیف ہے جسے غالب نے بعض وجوہ کی بناء پر اپنے نام سے شائع کرنا پسند نہیں کیا۔

اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد غالب جب گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو انھوں نے وقت گزارنے کے لیے محمد حسین دکنی کی مشہور فارسی لغت "برہان قاطع" (تصنیف ۱۶۵۲ء) کی ورق گردانی شروع کی۔ جہاں جہاں غلطیاں نظر آئیں، انھیں نشان زد کرتے گئے، یہ غلطیاں یک جا کیں تو اچھی خاصی ایک کتاب بن گئی۔ اسے انھوں نے ۱۸۶۳ء میں "قاطع برہان" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کتاب کا چھپنا تھا کہ بقول مولانا حالی "ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا" اور اس ایک کتاب کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان مخالفانہ کتابوں میں سے ایک "محرق قطع برہان" تھی جس کے مصنف منشی سید سعادت علی تھے۔ منشی جی نے غالب کی خوب خبر لی اور برہان قاطع پر اعتراضات کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ غالب کا ذکر خاصے طنزیہ انداز میں کیا۔ غالب یہ کتاب دیکھ کر آتش زیر پا ہوگئے۔ وہ اس کا دندان شکن جواب لکھنا چاہتے تھے، مگر اپنے نام سے نہیں کیونکہ ان کے نزدیک منشی سعادت علی ایک "شخص عامی" تھے اور ایسے شخص کو لائق خطاب سمجھنا غالب کے شایان شان نہیں تھا۔ اپنے نام سے کتاب نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غالب کتاب میں اپنی تعریف دیکھنا چاہتے تھے، ظاہر کے کسی اور کے نام سے چھپنے والی کتاب ہی میں ان کی مدح سرائی کی جا سکتی تھی۔

غالب نے اپنے بعض شاگردوں کو منشی کا جواب لکھنے پر اکسایا، مگر کوئی راضی نہ ہوا۔ مجبوراً خود ہی غالب کو یہ کام کرنا پڑا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب لکھی بلکہ خود ہی چھپوائی اور اس پر بطور

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مصنف میاں داد خاں سیاح کا نام درج کر دیا۔ سیاح دلی سے بہت دور سورت میں رہتے تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ ایک کتاب کے مصنف بن چکے ہیں۔ غالب نے انھیں کتاب کی طباعت کی اطلاع دی، انھوں نے نقد قیمت ادا کر کے اس کے بیس نسخے غالب ہی سے منگوائے۔ کتاب میں طباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں، غالب نے ایک نسخہ میں اپنے قلم سے اغلاط کی تصحیح کی اور سیاح کو لکھا کہ باقی نسخوں کو تم خود درست کر لو۔

اس کتاب میں غالب نے طرح طرح سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں اور منشی جی کا ذکر نہایت تحقیر سے کیا ہے۔ کتاب کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

"منشی سعادت علی، نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ، کسی بستی میں، کسی گاؤں میں، کسی گھاٹ پر، کسی بات پر اس بزرگ کا نام کسی نے نہیں سنا۔"

منشی جی کی کتاب کا سبب تالیف یہ بتایا ہے، "(غالب) کے جواب میں لکھنے سے منشی جی کی مراد یہ تھی کہ کنج خمول سے باہر آئیں اور ایک صاحب نام و نشان کے مقابل ہو کر خود بھی نام پائیں۔ یہ نہ سمجھے کہ مشہور نہ ہوں گے اشتہاری ہو جائیں گے۔ عزت نہ ملے گی، مورد صد گونہ خواری ہو جائیں گے۔" حیرت ہے کہ غالب کے عہد میں تو مشہور ہونے اور اشتہاری ہونے میں تمیز کی جاتی تھی لیکن آج کل ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا، جو جتنا اشتہاری ہوتا ہے، اسے اتنا ہی مشہور سمجھا جاتا ہے۔

منشی جی نے غالب کو جو ذہنی اذیت پہنچائی تھی، غالب نے اس کا بھرپور انتقام لیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

(۱) "ظاہراً منشی جی بطن مادر سے پڑھے لکھے روبکاریاں لکھتے ہوئے نکلیں ہیں۔"

(۲) "(منشی جی) کی عبارت کو لکھنا قلم کا منہ کالا کرنا ہے"

(۳) "مقدمات علمی میں منشی جی کا دخل بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسموعات میں بندر کا شطرنج کھیلنا اور مشاہدات میں بندریا کا ناچنا"

(۴) "اگر آدمی ہوتا تو حضرت غالب کی تحریر کو دیکھ کر اس بحث کے جواب کا عزائم نہ کرتا مگر چونکہ بے حیا ہے، تقریر سے باز نہیں رہا"

(۵) "خدا منشی کو سلامت رکھے، ظرفا کے نور بصر اور راحت جاں ہیں"

(۶) "کوئی احمق ہوگا، جو منشی جی کو احمق نہ جانے گا"

(۷) اہل عقل بے اس کے کہ میں کہوں، سمجھ جائیں گے کہ منشی جی سڑی ہیں، پاگل ہیں"

مگر سچی بات یہ ہے کہ منشی جی ایسے گئے گزرے بھی نہیں تھے جیسا کہ غالب نے انھیں پیش کیا ہے، وہ خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے غالب پر جو اعتراضات کیے تھے، وہ بڑی حد تک خالص علمی اعتراضات تھے۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے کہ غالب کے پاس ان کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ دو ایک جگہ غالب کو بادل نخواستہ شکست تسلیم کرنی پڑی تو اس کا انداز بھی "فاتحانہ" تھا۔ انھوں نے غلطی کو بھول چوک سے تعبیر کیا اور شرمندہ ہونے کا کام سیاح کے سپرد کر دیا۔ "لطائف غیبی" کی اشاعت کے ایک سال بعد انھوں نے مرزا رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھا: "وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے" یہ عجیب بات ہے کہ غلطی کریں غالب اور شرمسار ہوں میاں داد خاں۔

غالب نے منشی جی کی مذمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعریف کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مثلاً کتاب کے شروع ہی میں اپنا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "قاطع برہان کا مؤلف ایک شخص ہے معزز اور مکرم، والا رتبہ، عالی شان، عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محسوب، بادشاہ دہلی کے حضور سے مخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ یعنی غالب تخلص، اسد اللہ خان بہادر" یہی نہیں غالب نے اپنی عبارتوں کو "موتی کی لڑیاں" اور منشی جی کی عبارتوں کو "ماش کی لڑیاں" قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس کتاب کو شائع کر کے بڑی اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے مطالعے سے اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہمارا سب سے بڑا شاعر اپنی تعریف کے سوا کچھ اور سننے کا روادار نہیں تھا۔ وہ ذرا سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، آتش انتقام میں خود ہی نہیں جلتا تھا بلکہ معترض کو بھی جلا کر خاک کر دینے کی کوشش کرتا تھا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مقدمے میں کتاب سے متعلق ہر طرح کی تفصیلات پیش کی ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا کہ میاں داد خاں سیاح کون تھے، اور انھوں نے کس طرح زندگی بسر کی۔ سیاح ایک انتہائی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک عجیب و غریب کردار تھے۔ عادات و اطوار اور پیوست کلام کے اعتبار سے تو وہ موجودہ زمانے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ لڑکپن ہی میں سورت چلے آئے، شاعری اور سیاحت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ پوری زندگی انھی اشغال کی نذر کردی۔ ہندوستان بھر گھومتے پھرتے تھے۔ آج کلکتے میں ہیں تو کل لکھنؤ میں۔ کبھی دہلی میں ہیں تو کبھی آگرے میں، بمبئی، پونا، کانپور، مدراس، حیدرآباد، بنارس، بنگلور، شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں سیاح نہ گئے ہوں اور وہاں ان کے اعزاز میں مشاعرے نہ ہوئے ہوں۔

پبلک ریلیشنگ کے وہ زبردست ماہر تھے۔ ہر شہر میں ان کے جاننے والے موجود تھے، وہ انھیں اپنے ورود کی پہلے سے اطلاع کردیتے تھے، ہر جگہ ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی، مشاعرے اور رقص وسرود کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ دولت کی فراوانی تھی، دل کھول کر خرچ کرتے، ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے۔ یہاں تک کہ گاہے گاہے غالب کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ سیاح کی مالی حالت سے لوگ بے حد مرعوب تھے اور انھیں رئیس ابن رئیس سمجھتے تھے۔ مگر اصل معاملہ یہ تھا کہ انھیں "قلب سازی" کا فن آتا، یعنی جعلی نوٹ بنانے میں ماہر تھے، جوانی ہی میں یہ فن سیکھ لیا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک انھوں نے اس فن کو ذریعۂ معاش بنائے رکھا ۱۸۷۸ء میں جب ان کی عمر پچاس کے قریب تھی، بمبئی کے ریلوے اسٹیشن پر سو روپے کا جعلی نوٹ بھناتے ہوئے پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا اور چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور یوں شہروں گھومنے والا جیل کی چار دیواری میں مقید ہوگیا۔ پڑھے لکھے آدمی تھے، جیلر نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا۔ اس خدمت کے عوض سیاح کو جیل میں بھی گھر کا سا آرام ملنے لگا۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا، جیلر نے اپنی سفارش کے ساتھ ملکہ کو بھجوادیا۔ اس کے صلے میں سیاح کی باقی ماندہ سزا معاف کردی گئی۔ رہائی کے بعد وہ سورت چلے گئے اور باقی زندگی عسرت اور شعر گوئی میں بسر کردی۔ ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

انیسویں صدی کے اخباروں میں سیاح کا ذکر خاصا ملتا ہے۔ "اودھ اخبار" میں ان کے بارے میں جو خبریں شائع ہوئی تھیں، انھیں قاضی عبدالودود نے ایک مضمون میں جمع کردیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح آج کل کے ادیبوں کی طرح اخباری سطح پر زندہ رہنے کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو امریکی، کینیڈا اور خلیج کی ریاستوں کے مشاعروں میں ان کی بڑی مانگ ہوتی اور کئی جگہ ان کا جشن منایا جاچکا ہوتا۔

غلط نامۂ خامہ بگوش

وہی ہوا جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ بالآخر ہم سب صاحب کتاب بن گئے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی نے ہمارے ان کالموں کا انتخاب شائع کردیا ہے جو ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک "تکبیر" میں لکھے گئے تھے۔ کتاب کا نام ہے "خامہ بگوش کے قلم سے۔" اس پر مصنف کا نام الگ سے نہیں لکھا گیا، کتاب کے نام ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کارِ فضول کا ذمہ دار کون ہے۔ ناشر نے یہ احتیاط شاید اس لیے کی ہے کہ اُردو کی اکثر کتابیں محض اس لیے فروخت نہیں ہوتیں کہ ان پر مصنفین کے نام درج ہوتے ہیں۔ اس طرح مصنفین کی سبز قدمی ان کی کتابوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس احتیاط کے باوجود اگر ہماری کتاب گودام میں پڑی رہی تو اس کی ذمہ داری جناب مظفر علی سیّد پر ہوگی کیونکہ کتاب پر بطور مرتب انھی کا نام نامی درج ہے۔

اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن کب شائع ہوگا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پاکستانی ناشر صرف وہی کتابیں شائع کرسکتے ہیں جن کے اخراجات وہ مصنفین اٹھاتے ہیں۔ ہم سے تو کتاب کا مصنف ہونے کی تہمت ہی نہیں اٹھائی جاتی تو اخراجات کیا اٹھائیں گے۔ ویسے بھی اس کتاب میں پاکستانی قارئین کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے، سوائے اس دیباچے کے جو کتاب کے شروع میں بعنوان "غلط نامہ" شامل ہے۔ غلط نامہ کتاب کے آخر میں ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے شروع میں اس لیے رکھا ہے کہ کتاب اس کا ضمیمہ سمجھے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ دیباچہ ذرا تفصیل سے لکھیں گے اور جس طرح ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری اپنی ہر کتاب کا دیباچہ "ہبوطِ آدم" سے شروع کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی خالص علمی انداز سے بحث کا آغاز کریں گے۔ لیکن تادمِ تحریر ہمیں "ہبوط" کے معنی معلوم نہیں ہوسکے، اس لیے مختصر دیباچے پر قناعت کرنی پڑی۔ اب کے کالم کی جگہ یہی دیباچہ پیش کیا جارہا ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

خود اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کسی دوسرے کی کتاب پر لکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ پڑھے بغیر اس کی وہ خوبیاں تلاش کر لی جاتی ہیں جو اس میں نہیں ہوتیں۔ اپنی کتاب کی جھوٹی تعریف تو الگ رہی، سچی تعریف بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ خدشہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بھی جھوٹ ہی سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ہم یہ عرض کریں کہ اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے تو آپ پہلے لفظ ''سنجیدہ'' کے کئی بار استعمال پر مسکرائیں گے، اور پھر نہایت سنجیدگی سے یہ فرمائیں گے اگر یہ کتاب سنجیدہ ہے تو غیر سنجیدہ کتاب کسے کہا جائے گا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن خدا لگتی کہنے میں اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو یہ فرمائیے، کیا یہ کتاب ویسی ہی نہیں ہے جیسی اُردو میں عام طور پر تنقیدی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ اُردو کی تنقیدی کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ نہیں ہے بلکہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ ہاں کہیں کہیں دو اور دو کا حاصل جمع تین یا پانچ بھی ہو گیا ہے لیکن اس عمل کا اُردو کے محاورے ''تین پانچ کرنا'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محاورہ اُردو کے پیشہ ور نقادوں ہی کے حوالے سے اچھا لگتا ہے جو بقول شخصے، تنقید کم لکھتے ہیں، گھوڑوں پر رقم زیادہ لگاتے ہیں۔ گھوڑوں پر رقم لگانے میں کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ مگر ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے کیونکہ ہم سے وہ لوگ عموماً ناراض ہو جاتے ہیں جن کو موضوع بنا کر ہم اظہار خیال کی جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے لکھا ہے۔ مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے، صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔

بہر حال اب جب کہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے، ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے، ان سب کے لیے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی۔ محبت میں چونکہ سبھی کچھ جائز ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں بعض ایسی بھی باتیں آ گئی ہیں جنھیں غالب کے لفظوں میں ''سخن گسترانہ'' کہا جا سکتا ہے۔ امید ہے ہماری یہ ''سخن گستری'' آئندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ ''خوشگوار تعلقات'' سے

ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ لکھتے رہیں جو اب تک لکھتے رہے ہیں اور ہم ان کے لکھے پر بساط بھر اظہار خیال کرتے رہیں۔ جب ہم ان کے لکھے کا برا نہیں مانتے تو انھیں بھی ہمارے لکھنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

ممکن ہے ہماری مذکورہ بالا معذرت خواہانہ باتوں پر بعض لوگوں کو یقین نہ آئے، لہٰذا ہم ان کی تالیف قلب کے لیے اعلان کرتے ہیں کہ اس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں، سوائے لاغر مراد آبادی کے نام کے، وہ سب فرضی ہیں۔ ناموں کی جزوی یا کلی مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے، ارادی نہیں۔

ہمیں اس موقع پر وہ لوگ بھی یاد آ رہے ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ مرحومین کے بارے میں کوئی کالم کتاب میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مرحومین کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کا ذکر اسی طرح کرتے رہیں جس طرح ان کی زندگی میں کرتے تھے تاکہ وہ ہمیں اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب زندہ ادب کے بارے میں نہ سہی، زندہ ادیبوں کے بارے میں ضرور ہے۔

کالموں کا انتخاب شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جس ادبی معاشرے میں سب ہی صاحب کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے۔ مگر یہ جو ہمارے کرم فرما شاہد علی خاں صاحب ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے کالم مکتبۂ جامعہ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہوئے تو ضائع ہو جائیں گے۔ خان صاحب بڑے تجربہ کار ناشر ہیں اور دوسروں سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے ہی کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے لوٹتے ہیں اور جب ان کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لٹ گئے۔ ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخوں میں تو نہیں کاغذ کے ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔ ہم نے خان صاحب کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کو بہت کوششیں کی لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ رشید حسن خاں صاحب نے خان صاحب کی کچھ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ ہم ہر اس شخص سے ڈرتے ہیں جس کے نام

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

میں ''خاں'' کا لاحقہ شامل ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں خاں صاحب کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

کالم نگاری ہم بہت عرصہ سے کر رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی مجموعی ضخامت ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' سے کم نہیں ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کو پڑھ کر انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے، حشر کے دن گناہ گار عورتوں کو سزا ملے گی کہ انھیں صرف وہی کھانے کھلائے جائیں گے جو انھوں نے خود پکائے ہوں۔ اسی طرح لکھنے والے کو جو بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے اسی کی تحریریں پڑھوائی جائیں۔ ہم اس سزا کو بھگتنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ تو نہ کر سکے، البتہ سزا کا دورانیہ کم کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کے آٹھ برسوں کے دوران لکھے گئے کالموں میں سے کچھ کا انتخاب کر لیا جائے۔ ان کالموں کو ہم نے جمع کیا اور ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سب ہی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابلِ انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔

اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سیّد نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنی تحریروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتا کیوں کہ اسے اپنی ہر تحریر ''عالم میں انتخاب'' اور آپ کو ''کالم میں انتخاب'' نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کلام کونسا ہے اور برا کونسا۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کونسا کالم کم برا ہے اور کون سا زیادہ۔ انتخاب کرنے کا یہ کڑا معیار سیّد صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیونکہ ان کی نگاہ انتخاب خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدر دان ہے۔ اور پھر اس معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں۔ اس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سیّد صاحب نے مرتب فرمایا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ نظیر صدیقی صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کسی نقاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات کے ہوتے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سیّد صاحب نے نہایت توجہ اور محنت سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑی محنت سے ہمارے کالموں کو پڑھا۔ ان تمام کالموں کو مسترد کر دیا جن میں ان پسندیدہ شخصیات کو ہم نے مسترد

کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک وہ کالم بھی بے اعتبار ٹھہرا جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی واحد مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہوں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے اس کالم کی اشاعت کے بعد سیّد صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تنقید کی آزادی'' بالآخر شائع ہو گیا۔ مزید دو مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری کالم نگاری کا کم از کم ایک مثبت نتیجہ بھی ظاہر ہوا ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ سیّد صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطور انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی محنت اور ہماری ناکارکردگی کا دستاویزی ثبوت لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر کی طرح باقی رہ جائے، لیکن اس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے، لہٰذا دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اب ایک اور مشکل سامنے آ گئی کہ اگر سیّد صاحب کے تمام منتخبہ کالم شائع کیے جائیں تو ان کی ضخامت بھی قاری اور ناشر دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ مجبوراً منتخبہ کالموں میں سے بھی تقریباً نصف حذف کرنے پڑے۔

ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد نظرِ ثانی کا مرحلہ آیا۔ دو چار کالم پڑھ کر ہی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ بہر حال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ کتاب کے آخر میں ''غلط نامہ'' شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر خیال آیا کہ اردو کی کتابوں میں غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو خود غلط نامے کا نعم البدل ہوتی ہیں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

انکشافات اور اعترافات

دنیا میں دلچسپی کی بے مثال چیزیں ہیں، مگر انسان کو اپنی ذات سے جو دلچسپی ہوتی ہے، اس کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔ بعض لوگ تو پوری زندگی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں، اور آئینہ بھی جھوٹ بول بول کر یقین دلاتا رہتا ہے کہ دیکھنے والے کے سامنے اس کا عکس نہیں ہے بلکہ بقول قمر جمیل، آئینے میں پھول کھلا ہے۔ یہی غلط فہمی انسان کو زندہ رکھتی ہے۔

ع اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

آئینے میں اپنے عکس جمیل کا مشاہدہ کرنے کے یوں تو بے شمار ذریعے ہیں لیکن جنھیں لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہوتی ہے، وہ آپ بیتیاں تحریر کرتے ہیں اور روزنامچے لکھتے ہیں۔ اُردو میں ڈھائی تین سو سے کم آپ بیتیاں کیا لکھی گئی ہوں گی جو بیشتر ایسے لوگوں نے لکھی ہیں جن پر کچھ بیتی ہی نہیں تھی۔ روزنامچہ لکھنے کا رواج البتہ کم رہا ہے اور ایسے روزنامچے، جو لائق تذکرہ ہوں، ایک ہاتھ کی انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جا سکتے ہیں۔

اُردو کا پہلا قابلِ ذکر روزنامچہ تو وہ ہے جو مظہر علی سندیلوی نے ۱۸۶۷ء سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات (۱۹۱۱ء) تک باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ اس کا انتخاب مولوی صاحب کے پوتے، نامور اور بزرگ محقق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مرتب کیا تھا جو کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ روزنامچہ ایک اہم ثقافتی دستاویز ہے جس سے اودھ کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔

سب سے اہم اور دلچسپ روزنامچہ خواجہ حسن نظامی کا ہے جو انھوں نے تقریباً نصف صدی

تک مسلسل لکھا اور موجودہ صدی کے دوسرے عشرے سے اسے چھپوانا شروع کیا، یہاں تک کہ "روزنامچہ" کے نام سے ایک ہفتہ وار جریدہ بھی نکالا جس میں صرف روزنامچہ چھپا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب اپنے ذاتی کوائف ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے گردوپیش کے حالات بھی قلم بند کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کے روزنامچے میں ان کے زمانے کی پوری تاریخ سما گئی ہے۔ نیز برصغیر کی بے شمار اہم شخصیات کے بارے میں نادر معلومات محفوظ ہو گئی ہیں۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ اس روزنامچے کو مرتب کر دے تو اردو میں ایک انتہائی دلچسپ کتاب کا اضافہ ہو جائے گا۔

ایک قابلِ ذکر روزنامچہ پروفیسر اختر انصاری دہلوی کا بھی ہے۔ وہی اختر انصاری جن کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ان کا روزنامچہ "ایک ادبی ڈائری" کے نام سے ۱۹۴۴ء میں چھپا تھا۔ اس میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کے چار برسوں کے ادب کا تذکرہ ہے۔ ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا، صرف ادب اور ادیبوں کے معاملات و مسائل کے تعلق سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ روزنامچہ ان چار برسوں کے ادب کے بارے میں معلومات کا خزینہ ہے۔

اور اب ایک ایسا روزنامچہ منظر عام پر آیا ہے جو اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ ہمارے عہد کے ایک بڑے تخلیقی فن کار کی زندگی کا آئینہ ہے۔ یہ "ناصر کاظمی کی ڈائری" کے نام سے گزشتہ مہینے شائع ہوا ہے۔ ان میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۲ء تک کے اندراجات ہیں۔ آخری اندراج ناصر کی موت سے ایک دن پہلے (یکم مارچ ۱۹۷۲ء) کا ہے۔

ناصر کاظمی کو ۱۹، ۲۰ برس کی عمر ہی سے ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ ہر سال وہ نئی ڈائری میں اپنے معمولات درج کرتا تھا۔ یہ ساری ڈائریاں محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں، انھیں ناصر کے بیٹے سلطان کاظمی نے شائع کر دیا ہے۔ ناصر ہر روز ڈائری نہیں لکھتا تھا، اسی روز لکھتا تھا جب کوئی بات لکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ چونکہ ڈائری چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھی جاتی تھی، اس لیے اس میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جنھیں عموماً چھپایا جاتا ہے۔ انھیں باتوں کی وجہ سے یہ ڈائری ناصر کاظمی کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ناصر ایک حُسن دوست اور جمال پرست انسان تھے۔ اسے جہاں کہیں بھی حُسن دکھائی دیتا ہے، اپنی ڈائری میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ یہ حُسن اسے کبھی بادلوں میں نظر آتا ہے اور کبھی بارشوں میں۔ کہیں وہ رنگ برنگے پھولوں کا ذکر کرتا ہے اور کہیں خوبصورت پرندوں کا۔ یہ سب اس کی تنہائیوں کے رفیق ہیں اور وہ ان کی موجودگی سے خوش ہوتا ہے۔ پھولوں اور پرندوں کے ساتھ ساتھ انسانی حُسن بھی اسے بے حد متاثر کرتا ہے۔ ڈائری کے ابتدائی چند برسوں کے اندراجات میں ایک ایسے شخص کا بار بار ذکر آتا ہے جس کا اصلی نام ناصر نے اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہا ہے۔ وہ اسے "آنکھ کا تارا" کے فرضی نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

"غزل لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کچھ تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہیں۔ پتے جھڑنے کا موسم ہے۔ آرزوئیں جوان ہو رہی ہیں۔ ایک ایک پتا دل شب چراغ ہے۔ آنکھ کا تارا..... میرے درد کا درماں ہے لیکن اس کے درد کا درماں کوئی اور ہے۔ یہ خواب بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا کوئی کسی کا..... جس قدر احسان اس نے مجھ پر کیے ہیں، جتنا پیار اس نے مجھ سے کیا ہے، اس کا بدلہ چکانے کے لیے دوسری زندگی چاہیے۔ سو وہ تو ناممکن ہے۔ کاش کوئی غائبانہ طاقت اسے نیک صلہ دے۔ وہ ہنستا رہے، وہ خوش رہے۔

اس ڈائری میں زندگی کے حسن سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس کی تلخیوں کا بھی خاصا ذکر ہے۔ ناصر نے ڈائری کے شروع میں اپنے ابتدائی حالات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق انبالے کے ایک خوشحال گھرانے سے تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ خوش حالی، بدحالی میں تبدیل ہو گئی اور اسے نہایت صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ ڈائری کے متعدد اندراجات سے اس کے حالات کی تلخی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اپنی اٹھائیسویں سالگرہ کے دن اس نے لکھا، "میرا جنم دن۔ یتیمی، غریب الوطنی، بے زری دربدری۔" ان چار لفظوں میں اس کی پوری زندگی سمٹ کر آ گئی ہے۔

ناصر کی زندگی کس طرح گزری، اس کا اندازہ اس قسم کے اندراجات سے ہوتا ہے۔

۱۔ "دھوبی نے ادھار کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ میلے کپڑے پہن کر دفتر امروز گیا..... دس روپے غزل کا معاوضہ دل پر پتھر رکھ کر وصول کیا۔"

۲۔ "آج صرف ٹھنڈے پانی سے ناشتا کیا۔"

۳۔ "پیر صاحب نے ایک دفعہ مجھے تیس روپے بطور قرض دیے جو ابھی تک ادا نہیں کر سکا۔ لیکن جلد ہی لوٹا دوں گا۔ یہ فکر ہر وقت دامن گیر ہے۔ آج کل میں بہت سے احباب، ہوٹل والوں اور پان والوں کا مقروض ہوں۔"

ناصر کاظمی کو بجا طور پر احساس تھا کہ اس کی قدر نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے اس کے اندر کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے اس صورت حال کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ لکھتا ہے۔

"میں پچھلی رات کا ایک جادو ہوں، چڑھتے سورج کی دنیا کو اپنے لفظوں سے مسحور کرتا ہوں۔ مفلسی میری قسمت ہے..... اب بارش ہو رہی ہے۔ پتے جھڑ رہے ہیں، تانگوں کے چلنے کا شور اور بارش کی بوندوں کا ناچ میرے کمرے کے سکوت کو توڑ رہا ہے۔ موسم کی تین شمعیں روشن ہیں جن کی روشنی میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں۔ مر جاؤں گا تو دنیا روئے گی۔ بیسویں صدی کا سچا شاعر، مخلص منفرد شاعر، ناصر کاظمی۔ رہتی دنیا تک حساس دلوں کو گرمائے گا۔ میں چاند میں سو رہا ہوں گا..... ہرن جو پانی میں چاند کے عکس کے ساتھ دوڑتا دوڑتا چل بسا۔ شاعر ایک زخمی ہرن، چشمے کی تلاش میں ایک عرصہ سے سرگرداں ہے۔"

ناصر کاظمی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچی ثابت ہوئی۔ وہ خود موجود نہیں ہے مگر اس کی شاعری حساس دلوں کو گرما رہی ہے۔

مفلسی اور دربدری کے باوجود ناصر کاظمی نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ اس نے تلخی حالات کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس نہیں کیا۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھ کر قبول کرتا رہا۔ اپنی ڈائری میں وہ ایک زندہ دل اور باحوصلہ انسان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے اور مخلص دوستوں کی رفاقت حاصل تھی، ان کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا، ہوٹل میں بیٹھ کر ادبی گفتگو کرتا، اچھی اچھی فلمیں دیکھتا، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتا، لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور باغوں میں حسن فطرت سے ہم کلام کرتا۔

ناصر کی زندہ دلی کے نمونے ڈائری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے ظہیر کاشمیری کے ساتھ سفر کیا۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک نظم لکھی اور ظہیر کاشمیری کو سنائی۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اس کے چند شعر یہ ہیں:

دیوانے ظہیر کاشمیری
پروانے ظہیر کاشمیری
بولا یہ اک سپاہی سن کر
چل تھانے ظہیر کاشمیری
نیلام کی آ رہی آواز
آٹھ آنے ظہیر کاشمیری

ناصر پان کا بہت شوقین تھا۔ لاہور میں اچھا پان نایاب تھا۔ وہ گزرے ہوئے زمانے کے حوالے سے پان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

"پان تھا یا چراغ۔ شاہان مغلیہ کی آنکھ کا تارا۔ نواب واجد علی شاہ کا جگر گوشہ۔ ہیرا جیسی الائچی۔ چاندنی جیسا کتھا، ستاروں جیسی چھالیہ۔ پان کیا جیسے پرگ پر تتلی بیٹھی ہو۔ منہ میں جاتے ہی تاشے کی طرح گھل جائے۔ چونے کا مزہ، چن رس یعنی چاند کا رس۔ سلیقے سے تراشی ہوئی الائچیاں جیسے اوشا (صبح کی دیوی) کے دانت، موتیوں کی کلیوں جیسے۔ گرمی کی دوپہر میں کھاؤ تو سینہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اندھیری رات میں سینہ روشن ہو جائے۔ جاڑے میں پسینہ آنے لگے۔"

ناصر نے ڈائری اپنے لیے لکھی ہے، اس لیے وہ خود کلامی کا سا انداز رکھتی ہے۔ اس میں اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا فن ملتا ہے، اور بعض جگہ تو ناصر کی نثر نظم کی حدوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے:

"..... دیکھا کہ بانو کی گود میں چاند اترا ہے اور گھر کے صحن میں چاندنی بکھری ہوئی ہے۔"

ڈائری میں بے شمار ادیبوں کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کی خواہش تھی کہ ناصر کاظمی اس پر ایک نظم لکھ دے۔ جعفر طاہر کے بارے میں ناصر نے یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:

"صبح آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ جعفر طاہر میرے سرہانے کی کرسی پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا، تمہارے ایک شعر پر رونا آ گیا تھا۔ بقول انتظار حسین معلوم ہوا کہ حضرت باری باری سب کے شعروں پر رو چکے ہیں۔"

یہ ڈائری ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو ناصر کاظمی کی شخصیت اور اس کی شاعری کے پس منظر سے واقف ہونا چاہتا ہے اور موجودہ عہد کے ایک بڑے شاعر کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ادب یا مناجات بیوہ

ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیسا ہی مایوس کن ہو، ماضی کی طرح حال خاصا باثروت ہے۔ ہر پانچ اردو دانوں میں سے ایک غزل گو اور دوسرا مزاح نگار ضرور ہوتا ہے۔ اگر نقادوں اور محققوں کو بھی اس حساب کتاب میں شامل کر لیا جائے تو مزاح نگاروں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کا وہ حصہ بھی، جو مزاح کے نام سے پیش نہیں کیا جاتا، مزاح ہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں سنجیدہ کام نہیں ہو رہے۔ ہو رہے ہیں، اور بہت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہے ہیں، جن کا اندازہ وہاں کے سنجیدہ ادبی رسائل سے کیا جا سکتا ہے۔ شب خون، سوغات، ذہن جدید، شاعر، کتاب نما اور آج کل ایسے ہی چند ادبی رسائل ہیں۔ ''آج کل'' سرکاری رسالہ ہے اور اس کا سرکاری ہونا صرف اس کی کم قیمتی اور عمدہ طباعت سے ظاہر ہوتا ہے، ورنہ جہاں تک مندرجات کا تعلق ہے، یہ سراسر غیر سرکاری ہے۔ ہندوستان کے بہترین اردو ادب کا غالب حصہ اسی رسالے کے ذریعے منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا سرکاری رسالہ ''ماہِ نو'' اس وقت تک تو قدرے ڈھنگ کا تھا جب تک کشور ناہید اس کی ایڈیٹر تھیں، اب تو یہ مناجات بیوہ قسم کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اور کس خوشی میں شائع کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں کچھ تازہ ہندوستانی رسالے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ تو ممکن نہیں کہ ہم ان سب کا ذکر کریں، کالم کی محدود گنجائش کی وجہ سے خاص خاص رسالوں کا، اور ان کے بھی خاص خاص مندرجات کا ہی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

سہ ماہی ''ذہن جدید'' دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے مدیر زبیر رضوی ہیں جو موجودہ دور کے بہترین اُردو شاعروں میں سے ہیں۔ یہ رسالہ صرف ادب تک محدود نہیں، اس میں مصوری،

موسیقی، فلم، تھیٹر اور رقص کے بارے میں بھی تازہ ترین معلومات پر مبنی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے ادب کے تراجم پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ رسالہ پچھلے چار برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا سولہواں شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں سب سے اہم مضمون مجاز پر ہے جو وارث علوی نے لکھا ہے۔ یہ وارث کے دیگر مضامین کی طرح طویل تو ہے لیکن اس کی طوالت انحرافات کی وجہ سے نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ وارث نے ایک ایسا مضمون بھی لکھ دیا جو پورے کا پورا ایک ہی موضوع پر ہے، ورنہ وارث علوی جب کوئی تنقیدی مضمون لکھتے ہیں تو اصل موضوع کے ساتھ دس اور موضوعات سے بھی فراغت حاصل کر لیتے ہیں۔

مجاز اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعروں میں سے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی شاعری، ادب کی بجائے ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئی۔ وارث کے نزدیک یہ صورتِ حال مجاز کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے نہایت خوش اُسلوبی سے آج کے دور میں مجاز کی شاعری کی معنویت کو واضح کیا ہے۔ گویا یہ مضمون مجاز کی شاعری کی بازیافت کا درجہ رکھتا ہے۔

اس شمارے میں معین اعجاز کا مکاتیب ''اُردو تنقید میں غیر ملکی سرمایہ کاری'' ایک شگفتہ تحریر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو اکیاون فیصد تک سرمایہ کاری کی اجازت ہے لیکن اُردو تنقید میں صد فی صد غیر ملکی سرمایہ کاری ہو رہی ہے..... خدا کا شکر ہے پاکستان میں صورتِ حال مختلف ہے۔ ہم تنقید میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے قائل نہیں، اپنے ہی وسائل پر انحصار کرتے ہیں۔ اسی لیے اب تنقید صرف کتابوں کی رونمائیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے نقاد ماتھے کے ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی بجائے اپنے چھکڑے ہی کے ذریعے ادب کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

''سوغات'' بلاشبہ ہندوستان کا بہترین ادبی رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمود ایاز ہیں جو کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے مگر اب فکر انگیز اداریے اور تبصرے لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس رسالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی کتابت حیدر آباد دکن میں ہوتی ہے، چھپتا دہلی میں ہے اور شائع بنگلور میں ہوتا ہے۔ پڑھا ہر اس جگہ جاتا ہے جہاں اُردو پڑھنے والے موجود ہیں۔ اس کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں پاکستانی اہلِ قلم کی نگارشات کثرت سے شائع ہوتی ہیں اور بعض اہلِ قلم تو صرف اسی رسالے میں چھپنا پسند کرتے ہیں جیسے لاہور کے احمد جاوید جو بنیادی طور

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

پر صوفی ہیں لیکن غزل بھی بہت عمدہ کہتے ہیں۔ ''سوغات'' کے ذریعے ان کی جو غزلیں پڑھنے میں آئی ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

یوں دل سے الجھ نہ دیدۂ تر
ہے قطرہ فروش یہ سمندر
دنیا سے قدم بچا کے رکھنا
چبھ جائے گا پاؤں میں یہ کنکر

سوغات کے زیرِ نظر شمارے میں احمد جاوید کے علاوہ متعدد پاکستانی اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں، اور مختار صدیقی مرحوم پر تو پورا ایک گوشہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم نے مختار صدیقی مرحوم کو بھلا دیا اور ہندوستان والوں نے یاد رکھا۔

''سوغات'' میں اختر الایمان کی آپ بیتی قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ تازہ شمارے میں اس کا جو باب شامل ہے، وہ ۱۹۶۷ء کی ڈائری کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ نہایت دلچسپ ڈائری ہے اور اس سے اختر صاحب کی ذہنی کیفیات کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مجھے حیرت ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کی مشکلات کا اندازہ کیوں نہیں لگا سکتیں۔ اگر کسی قسم کی بات زبان پر لاؤ تو وہ اپنا رونا لے بیٹھتی ہے۔''

مزید لکھتے ہیں، ''ذہن پر ہر وقت چڑچڑا پن سوار رہتا ہے..... یہ بات ہر وقت دماغ پر سوار رہتی ہے کہ بیوی بچے بے حس ہیں۔ انھیں میرے تگ و دو کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔''

یہ چڑچڑا پن ۲۵۔۳۰ برس بعد بھی باقی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے انھیں بیوی بچوں سے شکایت تھی، اب ترقی پسندوں خصوصاً علی سردار جعفری سے ہے۔ فرماتے ہیں:

''بیشتر ترقی پسند جاگیردار اور بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے ادب میں وہی قدریں لے کر آئے تھے جنھیں وہ آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر ان قدروں کے اور ان جذبات کے پاؤں نہیں تھے۔ ان لکھنے والوں نے مقبول ہونے کے لیے سب کچھ کیا..... بس اپنی تنقیدوں اور تحریروں میں میرا ذکر نہیں کرتے۔''

۶ر جنوری ۱۹۶۷ء کا دن اس اعتبار سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ سارا دن اختر الایمان نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں گزارا۔ لکھتے ہیں:

''آج مجھ پر جھنجھلاہٹ اور غصہ سوار رہا۔ جب اسٹوڈیو سے روانہ ہوا اپنی موٹر پر غصہ آتا رہا۔ اس کے بعد موٹر کے کاریگر سجاد پر غصہ آتا رہا۔ جب گاڑی لے جاتا ہے پٹرول نکال لیتا ہے۔ گھر پہنچا تو گڈو پر غصہ آتا رہا۔ مٹھائی کھائے جاتا ہے اور ڈاڑھ کے درد کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نہیں ملا۔ واپسی پر میں اسے درزی کے پاس لے گیا مگر اس نے حسب وعدہ پتلون نہیں بنائی تھی۔ اسی خفگی میں گھر پہنچا تو پتہ چلا ٹیلیفون خراب ہے..... ٹیلیفون پر غصہ آتا رہا۔ سونے جا رہا تھا کہ اپنے کتے پر غصہ آتا رہا۔ جنگلی کتوں کی سی عادتیں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ آخر میں جب جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ یہ غصہ مجھے اپنے اوپر تھا۔ کوئی بھی چیز میرے قبضے میں نہیں۔''

اختر صاحب کے غصے کی یہ عادت ابھی تک باقی ہے۔ کبھی انھیں فیض پر غصہ آتا ہے، کبھی راشد پر، کبھی اقبال پر، کہ آخر ان تینوں میں ایسی کون سی بات ہے جو انھیں بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس غصے میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ہمیں بھی اس پر بے حد غصہ آتا ہے کہ آج کل بڑا شاعر بن جانا کتنا آسان ہو گیا ہے۔

اختر الایمان نے ۱۹۶۷ء میں تقریباً ایک مہینے تک بیروت، ماسکو، سٹیفن گراڈ، لندن، پیرس، اور قاہرہ کی سیر کی تھی۔ حیرت ہے کہ اس سیاحت کا احوال انھوں نے صرف دس بارہ صفحوں میں لکھا ہے۔ آج کل کے سفرنگار تو اپنے گھر سے ایئر پورٹ تک پہنچتے پہنچتے اس سے کہیں زیادہ صفحے سیاہ کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب نے سفرنامہ انتہائی عجلت میں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مقامات کے نام بھی انھوں نے ضرورت شعری کے تحت حسب منشا لکھ دیے ہیں۔ مثلاً..... کوہال بیک، لودر کو لودرے، وارسائے کو وارسیلز لکھا ہے۔

ماہنامہ ''ایوانِ اُردو'' دہلی اُردو اکیڈمی کا ترجمان ہے۔ محمود سعیدی اور زبیر رضوی اسے مرتب کرتے ہیں۔ یہ قدیم و جدید ادب کا ترجمان ہے۔ اس میں ادبی و تہذیبی خبریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں کشور ناہید دہلی گئی تھیں۔ ان کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی ہے؟

''تحریک نسواں کی علمبردار پاکستانی شاعرہ کشور ناہید کے اعزاز میں نارنگ ساقی کے گھر پر ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ کشور ناہید نے اپنی سوانح عمری ''بری عورت کی کتھا'' (جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے) کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے اور کہا کہ جو قاری اس کتاب کو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

یہ سمجھ کر پڑھنا چاہتا ہے کہ اس میں شاید میرے معاشقوں کا ذکر ہوگا، اسے یقیناً مایوسی ہوگی۔ میں نے تو اس میں پاکستانی عورت کے حالات کی عکاسی کی ہے کہ اسے پنپنے کے لیے کن حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔"

اس خبر میں نارنگ ساقی کا ذکر ہے، یہ وہی صاحب ہیں جن کی کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کا ذکر ہم نے دو تین ہفتے قبل اپنے کالم میں کیا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ ہم نارنگ ساقی کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی کتاب میں مذکورہ خبر کو بھی بطور لطیفہ شامل کر لیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ معاشقہ کرنے والے تو مایوس ہوئے ہی تھے، اب معاشقوں کا ذکر پڑھنے کے خواہش مندوں کو بھی مایوسی کا منھ دیکھنا پڑے گا۔

ہندوستانی رسالوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جن ادیبوں کی تخلیقات ان میں شائع نہیں ہوتیں ان کے خطوط شائع کر دیے جاتے ہیں۔ ان خطوط میں بعض تو ادبی تخلیقات سے بھی بہتر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خط رسالہ "آج کل" میں نظر آیا، جو پٹھان کوٹ کے شاعر پروین کمار اشک نے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

"جون کے آج کل میں غزل کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔ مگر حضرت نہ تو آپ نے میری غزل کے ساتھ میری تصویر ہی شائع کی اور نہ ہی میری دو غزلیں اشاعت کے لیے منظور کیں۔ یہ اس غریب کے ساتھ آپ کی بے پناہ زیادتی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں نئی نسل کا ممتاز شاعر ہوں، تین شعری مجموعے شائع ہو کر پوری اُردو دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔ تازہ شعری مجموعے "چاندنی کے خطوط" پروفیسر نثار احمد فاروقی کا تبصرہ..... طمطراق کے ساتھ شائع ہوا تھا..... اگر آپ نے مجھے میرے سچے حقوق سے اب بھی محروم رکھا اور سال میں دو بار دو دو غزلیں مع تصویر اہتمام کے ساتھ شائع نہ کیں تو میں بادل نخواستہ قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہو جاؤں گا اور اپنے حلقے کے ایم پی اے سے بات کر کے معاملہ پارلیمنٹ میں لے جاؤں گا..... مجھے امید ہے کہ آپ مجھے عدالت میں جانے پر مجبور نہ کریں گے۔"

ہماری رائے میں اشک کو عدالت میں ضرور جانا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی ایڈیٹر من مانی نہ کر سکے۔ عدالت میں جانے کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ مولانا حالی کی طرح اشک سے بھی ایک عدد مقدمۂ شعر و شاعری منسوب ہو جائے گا۔

ادب یا کاسۂ گدائی

شاعری اور نثر دونوں میں بیک وقت کمال حاصل کرنے کی روایت کا آغاز غالب سے ہوا تھا اور غالب ہی پر اس روایت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد جن ادیبوں نے دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش کی، ان کی ایک کشتی لازماً ڈوب گئی۔ اس کی سب سے بڑی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے جن کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ اپنا تخلص انھوں نے وطن کی آزادی کا خواہاں ہونے کی وجہ سے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے کے گلدستوں میں شاعروں کا کلام ان کے تخلصوں کے حروف تہجی کے اعتبار سے چھپتا تھا۔ گلدستوں میں پہلی غزل مولانا آزاد ہی کی ہوتی تھی۔ یہاں تک کے مولانا کے بڑے بھائی غلام یاسین آہ کی غزل بھی چھوٹے بھائی کی غزل کے بعد چھپتی تھی۔ ایک زمانے میں شاعر کی حیثیت سے مولانا کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی لیکن جب انھوں نے نثر لکھنی شروع کی اور اس میں کمال حاصل کیا تو رفتہ رفتہ ان کی شاعری کا چراغ بجھ گیا۔ شاعری کا حاصل صرف تخلص باقی رہ گیا جو بالآخر تحریک آزادی میں کام آیا۔

یہی حال نیاز فتحپوری کا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نیاز کا کلام اگر کتابی صورت میں یکجا کر لیا جائے تو اس کی ضخامت علامہ اقبال کے کلام سے دگنی ہوگی۔ نیاز نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کی اور فارسی میں بھی۔ مگر ان کی خوبصورت نثر کے سامنے ان کی شاعری حرف غلط ٹھہری۔ آج ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اور ہمارے سوا، شاید ہی کوئی ہوگا جو نیاز کے کلام سے لطف اندوز ہوا ہو۔ ڈاکٹر فرمان نے نیاز کی شاعری اس لیے پڑھی کہ وہ نیاز کے جانشین ہیں اور ضرورت شعری کے تحت خود بھی گاہے گاہے شعر کہتے ہیں۔ ہم کو نیاز کی شاعری سے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اس لیے دلچسپی ہوئی کہ ہم جانشین نیاز کے نیاز مند ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کا معاملہ بھی آزاد و نیاز سے مختلف نہیں ہے۔ وہ نجی صحبتوں میں شاعری پر ناز کرتے تھے، ہم کلے بندوں ان کی نثر پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے جو وقت شاعری پر صرف کیا، اگر اس میں بھی نثر پر توجہ کرتے تو بطور نثر نگار ان کا قد مزید بلند ہو جاتا۔

جس روایت کا خاتمہ غالب پر ہوا تھا، اس کا احیا ہمارے زمانے میں ہوا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ آج اُردو میں صفِ اوّل کے ایسے کئی شاعر موجود ہیں جنھوں نے اپنی نثر کا لوہا منوایا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ نثری نظم والے ہمارے اس جملے میں استعمال ہونے والے لوہے کو عام لوہا سمجھ لیں گے، اس لیے وضاحتاً عرض ہے کہ ہم نے محاورے والا لوہا استعمال کیا ہے، وہ عام لوہا نہیں جو استاد لاغر مراد آبادی کے ایک شعر میں ملتا ہے۔ اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ مشہور محقق اور شاعر افسر امروہوی مرحوم مانخ کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور رجب علی بیگ سرور کے اسلوب میں نثر لکھتے تھے۔ استاد لاغر سے ان کے بے تکلفانہ مراسم تھے، ذیل کا شعر انھی تعلقات کا آئینہ دار ہے:

کچھ تجھ کو خبر بھی ہے اے افسر امروہا
ہیں شعر ترے پتھر اور نثر تری لوہا

ہم معذرت خواہ ہیں کہ بامحاورہ جملے سے متعلق جملۂ معترضہ نے ہمیں اپنے موضوع سے دور کر دیا۔ ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ آج اُردو میں صفِ اوّل کے کئی ایسے شاعر موجود ہیں جنھوں نے نثر بھی بہت عمدہ لکھی ہے۔ مثلاً جمیل الدین عالی، شان الحق حقی اور ضیاء جالندھری۔ ایسے اور بھی کئی شعرا ہوں گے لیکن فی الحال ان تینوں ہی کے ذکر سے خوش ہو لینا ہی کافی ہے۔ حقی اور عالی کی نثر نگاری سے تو ایک دنیا واقف ہے کہ یہ دونوں سالہا سال سے لکھ رہے ہیں اور مضامین نو کے انبار لگا رہے ہیں۔ لیکن ضیاء جالندھری کی نثر ان کی شاعری کے مقابلے میں خاصی کم ہے اور اس کا حلقۂ اشاعت بھی محدود ہے کیونکہ یہ ایک ادبی ماہنامے "علامت" (لاہور) میں چھپتی ہے جو اشاعت کے اعتبار سے بھی خاصا علامتی رسالہ ہے۔ "علامت" گزشتہ پانچ چھ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ ضیاء جالندھری اس کے مدیر اعزازی ہیں اور اس میں "ابتدائیہ" کے عنوان سے اداریہ لکھتے ہیں جو عام رسالوں کے روایتی اداریوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ اگر یہ

کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ضیاء جالندھری کا ہر ابتدائیہ ایک فکر انگیز مقالہ ہوتا ہے جس میں کسی اہم ادبی مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ابتدائیے کتابی صورت میں مرتب کر دیے جائیں تو محمد حسن عسکری کی کتاب "جھلکیاں" کی طرح ایک اور اہم کتاب منظرِ عام پر آ سکتی ہے۔

"علامت" کے تازہ شمارے میں جو ابتدائیہ شائع ہوا ہے، اس کا موضوع تیسری دنیا کا ادب ہے۔ آج کل مغرب میں تیسری دنیا کے ادب کو جو اہمیت دی جا رہی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے ضیاء جالندھری نے بتایا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے سے تیسری دنیا میں جو صحت مند معاشرتی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں، ان کے خوشگوار اثرات تیسری دنیا کے ادب پر بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں صورتِ حال تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں، ملک میں مروّج جاگیرداری نظام کی وجہ سے وہ اب بھی بدستور موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ادیب جو ادب کو غیر ادبی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے، پس منظر میں چلے گئے اور ایسے ادیب نمایاں ہونے لگے جنھوں نے ایک مخصوص سیاسی جماعت سے وابستگی کو نجات کا ذریعہ سمجھا، اور ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء کے بعد مزاحمتی ادب کا نعرہ لگایا اور یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے مارشل لاء کے زمانے میں مزاحمتی ادب تخلیق کیا تھا۔

ضیاء جالندھری نے جو بحث کی ہے، اس کا خلاصہ ہمارے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ افراد جو صحیح معنوں میں ادیب نہ بن سکے، غلط معنوں میں مزاحمتی ادیب بن گئے۔ یہ مزاحمتی ادیب موجودہ نام نہاد جمہوریت کی بحالی کا سہرا اپنے سر باندھ کر حکومت سے حقِ خدمت وصول کرنے میں مصروف ہیں۔ ضیاء جالندھری اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ مزاحمتی ادیب، جن کو اشفاق احمد مخاصمتی ادیب کہنا پسند کرتے ہیں، خود کو ترقی پسند تحریک ہی سے وابستہ رکھتے ہوئے اپنی اپنی مزاحمتی تحریروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی یہ تحریریں مزاحمتی کم ہیں، خود ستائشی زیادہ ہیں۔ یہ دراصل اپنی ذات کی نمائش سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں اور کسی قسم کی اقدار کے فروغ سے کم۔ ان ادیبوں میں سے کئی ایک ایسے بھی تھے جو خشوع و خضوع سے مارشل لاء کا ساتھ دے رہے تھے اور در پردہ ان کے مخالفین سے بھی راہ و رسم رکھے ہوئے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت سند رہے اور کام آ جائے۔ بہر حال سیاسی پارٹیوں سے انھوں نے اپنے تعلقات عامہ نہایت خوبی سے برقرار رکھے۔ لہٰذا جب ایک سیاسی پارٹی، جس کا شروع میں بائیں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

بازو کی طرف جھکاؤ تھا اور جس کے سیاسی نظریات اب تبدیل ہو چکے ہیں، برسر اقتدار آئی تو یہ لوگ ملازمتیں، مراعات اور رعایتیں حاصل کرنے کے لیے دوڑے اور کچھ ان میں سے کامیاب ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جنھوں نے مارشل لاء کے دوران کچھ نہ کچھ ایسا کہا تھا جس کو مارشل لاء کی مخالفت تصور کیا جا سکتا تھا، مگر کچھ ایسے بھی تھے جن کی تحریروں میں ترقی پسندی یا مزاحمت نام کو بھی نہیں تھی اور ان کا سرکار دربار میں وجود بھی اس سیاسی پارٹی کے شدید مخالفین کی وجہ سے تھا۔ لیکن اب انھوں نے جلدی سے اپنی وفاداریوں کا اور پرانی ہمدردیوں کا برسر اقتدار حکومت کو یقین دلایا اور ان کے ساتھ اپنے رشتے استوار کرنے کی کوشش کی۔ یہ دراصل خون دینے والے مجنوں نہیں تھے، دودھ پینے والے مجنوں تھے۔"

دودھ پینے والے مجنوں کا قصہ، بقول ضیاء یہ ہے کہ ایک شخص مجنوں کا روپ دھار کر لیلیٰ کے بھیجے ہوئے دودھ کے پیالے کئی روز تک پیتا رہا۔ لیلیٰ کو شک ہوا تو اس نے آزمانے کو بلوایا کہ آج پیالے میں اپنا خون بھیج دو۔ یہ سن کر جعلی مجنوں نے جواب دیا، خون دینے والا مجنوں کہیں صحرا میں ہوگا، اسے وہاں جا کر ڈھونڈو۔

ایک مزاحمتی ادیب، جنھیں حال ہی میں ایک غیر مزاحمتی یعنی بغیر کام کی اعلیٰ ملازمت ملی ہے، اتفاقاً ایک محفل میں مل گئے۔ ہم نے انھیں ضیاء جالندھری کے مذکورہ بالا خیالات سے آگاہ کیا تو انھوں نے فرمایا:

"ہم پر خودستائی اور اپنی ذات کی نمائش کا الزام نیا نہیں ہے۔ ادب تو خودستائی اور اپنی ذات کی نمائش کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ علامہ اقبالؒ نے جو خودی کو بلند کرنے کا فلسفہ پیش کیا ہے، وہ دراصل خودستائی اور ذات کی نمائش کا فلسفہ ہے۔ اگر ادیب اپنی ذات کو نظر انداز کر دے تو ادب ادب نہیں رہے گا تصوف بن جائے گا۔ ضیاء جالندھری کا یہ کہنا ہے کہ ہم مارشل لاء کا ساتھ بھی دے رہے تھے اور در پردہ مارشل لاء کے مخالفین سے ساز باز بھی رکھتے تھے، بالکل غلط ہے۔ ہم نے مارشل لاء کے مخالفین کا کھلم کھلا ساتھ دیا ہے، در پردہ تعلق مارشل لاء والوں سے تھا کہ بہر حال وہ بھی غیر نہیں تھے، اپنے بھائی بند ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مارشل لاء لگانے والوں میں سے کئی آج ہماری حکومت میں بھی شامل ہیں۔ ہم نے کبھی وفاداریاں نہیں بدلیں۔ وفاداریاں اپنا راستہ خود متعین کرتی ہیں۔ باقی رہی دودھ پینے کی بات تو ضیاء الحق کے دور میں اشفاق احمد اور

ضیاء جالندھری دودھ پیتے تھے۔ اب ہمارا دور آیا ہے تو ہم بھی یہی شغل کر رہے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ وہ خالص دودھ پیتے تھے ہم ملاوٹ والا دودھ پی رہے ہیں کیونکہ دودھ کم ہے اور پینے والے زیادہ ہیں۔"

معاملہ واقعی بہت سنگین ہے۔ مزاحمتی ادب اتنا نہیں لکھا گیا جتنے مزاحمتی ادب لکھنے والے پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ سب اپنی خدمات کا صلہ چاہتے ہیں مگر حکومت کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ایسی ملازمتیں جن پر اہل مزاحمت کا یعنی ضرورت مند ادیبوں کا تقرر کیا جا سکے، محدود تعداد میں ہیں۔ ظاہر ہے تمام امیدواروں کی خواہشات پوری نہیں کی جا سکتیں۔ ضیاء جالندھری نے اس صورت حال کی عبرتناک تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

"سرکاری محکموں میں چھ سات اعلیٰ درجے کی ملازمتیں ایسی ہیں جن پر جائز یا ناجائز طریقوں سے ادیبوں کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ ان ملازمتوں کے لیے ادیبوں میں جو رسہ کشی ہوتی ہے، جو ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں اور جو بھاگ دوڑ کی جاتی ہے، اس کے انداز کچھ ایسے ہیں کہ پیشہ ور گدا گر بھی شرما کے رہ جائیں۔ یہ بات صرف ملازمتوں تک ہی درست نہیں، دوسرے معاملات میں بھی یہی حال ہے۔ خواہ وہ یوم پاکستان کے اعزازات ہوں یا پلاٹ ہوں یا دوسری مراعات۔ ادیب اسی طرح ان کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹتے ہیں جیسے معاشرے کے دوسرے افراد..... افسوس اس بات کا ہے کہ لوگ ادیبوں سے بہتر توقعات رکھتے ہیں۔ ان سے یہ امید وابستہ کی جاتی ہے کہ وہ خیر کی اقدار کے رکھوالے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں ہی سے نہیں، اپنے اعمال سے بھی لوگوں کو صحیح راہ دکھائیں گے۔ یہ نہیں کہ اپنی تحریروں میں تو وہ خود کو مظلوم، مقتول اور زخمی کہیں، مگر خود سرمایہ دارانہ نظام کی مثال بن کر سرکار سے پلاٹ لیں، بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کریں، بینک بیلنس میں اضافہ کریں۔ اعلیٰ ملازمتوں پر بغیر استحقاق کے قبضہ کریں، جھوٹ اور فریب پر زندگی کی بنیاد رکھیں اور خود کو مزاحمتی ادب کا علمبردار کہیں۔"

ضیاء جالندھری کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دن گئے جب ادیب خیر کی اقدار کے رکھوالے تھے۔ موجودہ زمانہ خیر خیرات کا ہے اور اس کی اقدار الگ ہیں۔ گدا گر شرماتے ہیں تو شوق سے شرمائیں، ادیب اگر شرمانے لگے تو پھر مزاحمتی ادب کون تخلیق کرے گا؟

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ادبی تنقید اور ظالم سماج

کئی مہینوں سے اخبار ''جنگ'' کراچی میں ''میں کیوں لکھتا ہوں'' کے عنوان کے تحت ایک سلسلہ مضامین شائع ہو رہا ہے جس میں اب تک ڈیڑھ دو درجن افراد طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ جن ''ادیبوں'' نے یہ مضامین لکھے ہیں، انھیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ ان کا ہے جنھیں لکھنے لکھانے کا شغل ترک کیے ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں، اور اب ان کا شمار گم شدگان ادب میں ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے ادیب ہونے کی اطلاع اسی سلسلہ مضامین سے ملی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح بین الاقوامی مشاعروں کے منتظمین اپنے اہل خانہ کو بھی بطور شاعر زحمتِ کلام دینے سے دریغ نہیں کرتے، اسی طرح ''جنگ'' والوں نے بھی کچھ خانہ ساز ادیبوں کو زحمتِ تحریر دی ہے۔ حالانکہ ان سے ایک الگ عنوان کے تحت لکھوایا جا سکتا تھا جو یہ ہونا چاہیے تھا، ''میں کیوں نہیں لکھتا''۔ اس عنوان میں اظہار خیال کی گنجائش زیادہ ہے، جبکہ پہلے عنوان کے تحت لکھنا بے حد مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ننانوے فیصد لکھنے والے یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ کیوں لکھتے ہیں اور کیا لکھتے ہیں۔

لیکن ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ ''جنگ'' کے سلسلہ مضامین میں زحمتِ تحریر اُٹھا کر زحمت خواندگی دینے والوں میں وہ لکھنے والے شامل نہیں جن کی حیثیت مستند ہے اور جن کا لکھا کاغذ پر بھی پتھر کی لکیر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ محسن بھوپالی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور قمر جمیل جیسے اہم ادیبوں نے جو مضامین لکھے ہیں، اس لائق ہیں کہ انھیں توجہ سے پڑھا جائے۔

محسن بھوپالی نے یہ بتانے سے پہلے کہ وہ کیوں لکھتے ہیں، یہ راز فاش کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا کہ انھوں نے لکھنا کب شروع کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جب بہت چھوٹے تھے تو

مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے، اس وجہ سے ان کے دل میں کچھ کہنے اور گرد و پیش کے حالات سے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوا جو شعر کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ محسن کی شاعرانہ شخصیت کے پیچھے دل اور دماغ دونوں کارفرما ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کی کارفرمائی کے بغیر بھی بعض شعرا اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے اپنے مضمون میں اپنی عمر نہیں لکھی، اس لیے ہم جیسے سادہ لوحوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مسلم لیگ کے کس دھڑے کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ آج کل مسلم لیگ کئی دھڑوں میں منقسم ہے، تین کے نام ہمیں یاد ہیں: جونیجو لیگ، نواز لیگ اور پگارا لیگ۔ محسن کے کلام میں جو گہرا طنز اور شگفتہ مزاح پایا جاتا ہے، اس کی بنا پر گمان غالب ہے کہ وہ پگارا لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے ہوں گے۔ پیر پگارا کی مسلم لیگ کا سیاست میں وہی مقام ہے جو کبھی صحافت میں حاجی لق لق کے نکاہیہ کالموں کا ہوتا تھا۔ محسن بھوپالی خوش قسمت ہیں کہ وہ اس مسلم لیگ کے جلسوں میں محض شرکت کی وجہ سے بڑے شاعر بن گئے، اگر کہیں وہ اس جماعت کے عہدے دار ہوتے تو خدا جانے کیا کچھ بن جاتے، کم از کم اکادمی ادبیات کے چیئرمین تو بن ہی جاتے۔

محسن بھوپالی نے ''میں کیوں لکھتا ہوں'' کا جواب دینے کی بجائے اپنی شاعری کا منشور پیش کر دیا ہے جو انھی کے الفاظ میں یہ ہے:

''میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کی بجائے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیئتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، اس لیے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں متحرک عوامل کا مظہر ہیں۔ ماحول کے دلآویز رنگین پردوں میں چھپی ہوئی تلخ حقیقتوں کا اظہار میرا مسلک رہا ہے اور پستی کی وادی میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن۔''

یہ منشور شاعری سے زیادہ کسی سیاسی جماعت کا معلوم ہوتا ہے۔ ویسے بھی بھٹکتی ہوئی انسانیت کی خدمت شعر کہنے کی بجائے کسی فلاحی ادارے سے منسلک ہو کر بہتر طور انجام دی جا سکتی ہے۔ شعر و شاعری سے بھٹکتی ہوئی انسانیت کے مزید بھٹک جانے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ محسن بھوپالی کی عظمت ہے کہ انھوں نے شاعری ہی کو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ذریعہ بنایا، اس بنا پر اگر انھیں ادب کا عبدالستار ایدھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ امید ہے جب وہ عوام کی فلاح و بہبود کا فریضہ پوری طرح انجام دے لیں گے تو پھر شاعری کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ کم از کم یہ تو وہ کر ہی سکتے ہیں کہ ان کا اگلا دیوان شاعری کی بجائے نثر میں ہو۔

صاحب فکر نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے نہایت فکر انگیز پیرائے میں بتایا ہے کہ وہ کیوں لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''میں اپنی آواز کی گونج سننے کے لیے لکھتا ہوں اور بسا اوقات آواز واپسیں اصل آواز سے زیادہ دلکش نظر آتی ہے اور میں اس نوع کی لذت کے لیے لکھنے کے عمل کو جاری رکھتا ہوں اور شاید یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے وجود کی توثیق کرتا ہے اور انفادیت پسندی کے دور میں اپنی تحریروں کو سماج کے لیے مفید اور ضروری گردانتا ہے۔ اگر لکھنے والوں کے لیے اس کی تحریریں مفید، ضروری اور اہم نہ ہوں تو وہ کیوں لکھے۔''

ساری باتیں بہت اونچی سطح سے کہی گئی ہیں، اس لیے اس تحریر کا جتنا حصہ ہماری سمجھ میں آیا ہے اُس کی بنیاد پر ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جب آپ نے اپنی آواز کی گونج سن لی تو پھر اپنے سامنے ظالم سماج کی دیوار کھڑی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ضمنی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ اپنی آواز واپسیں سننے کی لذت حاصل کرنے کے لیے لکھتے ہیں تو یہ لذتیت پسندی سماج کے لیے مفید اور ضروری کیوں کر ہو سکتی ہے؟ کیا سماج بھی لذتیت پسند ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تنقید کو دنیا کی لذیذ ترین چیزوں میں شمار کرنا چاہیے۔ اسے کتابوں کی بجائے مٹھائی کے ڈبوں میں بند کر کے اہلِ ذوق میں تقسیم کرنا چاہیے۔

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر قمر جمیل نے سوال کا جواب دینے سے پہلے فرمایا:

''میں اگر علمی خانوادے میں نہ پیدا ہوتا یا خدانخواستہ کم علم اور جاہل ہوتا تو شاعر یا ادیب کیسے بنتا۔ اگر میں کسی دکان دار کے گھر پیدا ہوتا تو بہی کھاتا لکھ رہا ہوتا۔ اگر حکیم ہوتا تو نسخے لکھ رہا ہوتا۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حالات ہمیں وہ بنا دیتے ہیں جو ہم ہیں۔ دکان دار کی ایک مجبوری ہے، بہی کھاتا لکھنا۔ اسی طرح نسخے لکھنا حکیم کی مجبوری ہے۔ لیکن میں جو لکھتا رہا ہوں وہ کسی اس طرح کی غرض سے نہیں ہے۔ لکھنا میری مجبوری نہیں، میری آزادی ہے۔''

ہم نہایت ادب کے ساتھ قمر جمیل کے اس خیال سے اختلاف کریں گے کہ شاعر یا ادیب بننے کے لیے عالم فاضل ہونا ضروری ہے۔ موجودہ دور کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے نام لے کر ہم اپنی بات کو مدلل بنا سکتے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ اس فہرست میں ہمارا نام بھی آئے گا، بہتر یہی ہے کہ پرانے شاعروں کے حوالے سے بات کی جائے۔ آج سے نصف صدی پہلے لکھنؤ کے مشہور ادیب مرزا فدا علی خنجر نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''اُردو کے اَن پڑھ شعرا'' ہے۔ یہ کتاب بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اُردو کی ترویج و اشاعت کے خیال سے شائع کی تھی۔ اس میں ساٹھ ایسے شعرا کے حالات ہیں جو اَن پڑھ ہونے کے باوجود آج کے بہت سے شاعروں سے اچھا شعر کہتے تھے۔ پرانے اور نئے شاعروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پرانے شاعروں کی شاعری سے ان کا اَن پڑھ ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا جبکہ نئے شاعروں کی شاعری ان کے علم و فضل پر دبیز پردہ ڈال دیتی ہے۔

قمر جمیل کے اس خیال سے بھی ہم متفق نہیں ہیں کہ دکان دار کے گھر دکان دار ہی پیدا ہوتا ہے اور حکیم کے گھر حکیم۔ شاعروں کے پرانے تذکرے اٹھا کر دیکھ لیجیے تو ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ شاعر صرف شاعروں ہی کے گھرانوں میں پیدا نہیں ہوتے تھے بلکہ انھیں ہر طرح کے گھرانوں میں پیدا ہونے کی آزادی تھی۔ غالب کے بزرگ ہم عصر حکیم قدرت اللہ قاسم نے شاعروں کا ایک ضخیم تذکرہ ''مجموعۂ نغز'' کے نام سے لکھا ہے جسے آج سے ۷۲ سال پہلے حافظ محمود شیرانی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بے شمار شاعر ایسے خاندانوں کے چشم و چراغ تھے جن کا شاعری سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ نہ جانے کتنے لوہار، بزاز، فیل بان، مہاجن، سوداگر، سنار، درزی، رفوگر، حجام، جراح، سقے، یہاں تک کہ خاکروب بھی شاعر تھے۔ یہ سب اپنی اپنی پیشہ ورانہ خدمات بخوبی انجام دیتے تھے اور شاعری بھی ٹھیک ٹھاک کر لیتے تھے۔ ہاں نثری نظم نہیں لکھتے تھے کہ اس زمانے میں شاعری میں غیر شاعرانہ تجربے کرنے کا رواج نہیں تھا۔

قمر جمیل کیوں لکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب انھی کی زبان میں یہ ہے:

''سچ پوچھیے تو میں قطعیت سے نہیں کہہ سکتا کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔ کیونکہ میں قطعیت سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کائنات کیوں موجود ہے، میں کیوں موجود ہوں۔ علت و معلول کا قانون اس طرح سچ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کھائے ہوئے ہے کہ قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی چیز کس چیز کا سبب ہے۔ تو پھر یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس لیے لکھتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ میں سوچتا ہوں، اس لیے موجود ہوں۔ میں ذرا سی تحریف سے یہ کہوں گا کہ میں سوچتا ہوں، اس لیے لکھتا ہوں۔ لیکن اتنا ہی درست یہ خیال بھی ہوگا کہ میں پڑھتا ہوں، اس لیے لکھتا ہوں اور اس سے زیادہ یہ خیال صحیح ہوگا کہ میں زندہ ہوں، اس لیے میں لکھتا ہوں۔ اس طرح یہ خیال بھی صحیح ہوگا کہ میں ابلاغ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے زیادہ یہ بات صحیح ہوگی کہ میں اظہار کرنا چاہتا ہوں اس لیے لکھتا ہوں۔ اگر کسی کا یہ قول صحیح ہے کہ پرندے کا چہکنا ہی پرندے کے وجود کا اظہار ہے تو ہماری تحریریں ہی ہمارے وجود کا اظہار ہیں۔"

قمر جمیل نے بڑی خوبصورت باتیں کی ہیں۔ اگر مذکورہ اقتباس کو ۲۰، ۲۵ سطروں میں منقسم کر دیا جائے تو ایک بے مثال نثری نظم وجود میں آ جائے گی۔ اس نظم پر کوئی صاحب علم و فضل ہی تبصرہ کر سکتا ہے۔ ہمیں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پرندے بہت سمجھدار ہیں کہ صرف چہک کر مطمئن ہو جاتے ہیں، اپنی چہچہاہٹ کو کتابی صورت میں نہیں چھپواتے۔

(۱۴ ستمبر ۱۹۹۵ء)

شاعری: مجبوری یا معذوری؟

ہمارا پچھلا کالم روزنامہ "جنگ" کراچی میں شائع ہونے والا اس سلسلۂ مضامین کے بارے میں تھا جو "میں کیوں لکھتا ہوں" کے زیرِ عنوان شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ کالم پڑھ کر ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب منظر علی خاں منظر نے شکایت کی ہے کہ ہم نے جانب داری سے کام لیا ہے اور اس سلسلے کے بہترین مضامین کو نظر انداز کر دیا ہے۔ منظر صاحب کی رائے میں بہترین مضامین وہ ہیں جو پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر عتیق احمد، احمد ہمدانی اور خود منظر صاحب نے لکھے ہیں۔ آخر الذکر کی حد تک تو ہم منظر صاحب سے متفق ہیں کیونکہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے بہترین ہونے میں کسی اور کو ہو تو ہو، خود منظر صاحب کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ ہم نے بھی اس شبے کا فائدہ انہی کو پہنچایا ہے اور تعزیرات پاکستان سے بھی ہمارے اس اقدام کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن منظر صاحب نے ہم پر جانب داری کا جو الزام لگایا ہے، اس کی ہم سختی سے تردید کریں گے۔ جانب داری سے آدمی اس وقت کام لیتا ہے جب کسی کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ کالم نگاری سے ہم خود اپنے آپ کو کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے تو کسی دوسرے کی خدمت کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ کالم بھی ہم منظر صاحب جیسے مخلص کرم فرما کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں، ان کی شکایت کے ازالے کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اگر شکایت کے ساتھ کچھ اور چیزوں کا بھی ازالہ ہو جائے تو اس کے لیے پیشگی معذرت قبول فرمائی جائے۔

منظر صاحب نے یہ کرم بھی فرمایا ہے کہ نہ صرف اپنا مضمون بلکہ مذکورہ تینوں ادیبوں کے مضامین بھی عنایت کیے ہیں۔ ہم نے ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اگر یہ مضامین ہماری نظر سے نہ گزرتے تو ہمارا علم، جو پہلے ہی بہت ناقص ہے، اس کے مزید ناقص ہونے کے امکانات

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

روشن نہ ہوتے۔

ہمارے نزدیک سب سے عمدہ مضمون سحر انصاری کا ہے۔ فرماتے ہیں:

"لکھنے کا عمل میرے لیے بیک وقت تلوار بھی ہے اور سپر بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں تلوار سے بھی سپر ہی کا کام لیتا ہوں۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی فرد یا ادارہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، میرا دشمن بننا چاہتا ہے، میرے بارے میں کوئی منفی رویہ اختیار کرتا ہے تو میں جواباً یا تو کوئی اچھی کتاب پڑھتا ہوں یا نظم و نثر سے اپنے قلم کا رشتہ استوار کر لیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ منفی رویوں کا جواب دینے سے بہتر ہے کہ کوئی ایسی تحریر معرضِ وجود میں لائی جائے جس سے مخالفین کا جذبۂ حسد اور بھڑکے۔ جواب در جواب کی حماقت میں پھنس کر میں اپنا وقت ضائع اور دشمن کا دل ٹھنڈا نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح میری تحریر میری تلوار بھی ہے اور سپر بھی۔ لیکن میں تحریر کی تلوار سے بھی سپر ہی کا کام لیتا ہوں۔"

تلوار اور سپر کا مضمون یگانہ نے بھی باندھا تھا۔

تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کتا جا

مگر جو بات سحر انصاری کی نثر میں ہے وہ یگانہ کے شعر میں نہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہم سحر انصاری کی خوب صورت نثر کی داد دیں گے۔ آج کے دور میں جبکہ شاعری نثر کی طرح بے مزہ ہوتی جا رہی ہے، ایسی نثر لکھنا جو بیک وقت شعری و نثری محاسن کی آئینہ دار ہو، بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کو سحر انصار نے جس آسانی سے انجام دیا ہے، اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ سحر انصاری نغز گو شاعر ہیں لیکن جو شخص ایسی عمدہ نثر لکھنے پر قادر ہو اُسے الگ سے شعر کہنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح وہ تلوار سے سپر کا کام لیتے ہیں، اسی طرح وہ با آسانی نثر سے شاعری کا کام بھی لے سکتے ہیں۔

مذکورہ اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سحر انصاری ہر وقت حالتِ جنگ میں رہتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں جو حسد کی تلواروں سے وار پر وار کر رہے ہیں۔ سحر انصاری کسی وار کو اپنی تلوار سے اور کسی کو سپر سے روک لیتے ہیں۔ وار روکنے کے اس عمل کے دوران جب کبھی تھوڑا سا وقفۂ امن ملتا ہے، اس میں کوئی اچھی کتاب پڑھ لیتے یا پھر کوئی مضمون یا

غزل لکھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران مطالعے اور تحریری شغل کے لیے بہت کم وقت ملتا ہوگا، اس کے باوجود سحر انصاری کا مطالعہ اور تحریری کام ان ادیبوں سے بدرجہا بہتر ہے جنھیں کبھی میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہونے کا موقع نہیں ملا اور جن کی ساری زندگی بے عملی میں گزری ہے۔

ممکن ہے کہ بعض بے خبر یہ کہیں کہ سحر انصاری تو نہایت امن پسند ادیب ہیں، اور پاکستان کے واحد ادیب جن کا کوئی دشمن نہیں، وہ سب سے اور سب اُن سے محبت کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے یہ کیوں کہا کہ وہ ہر وقت میدانِ جنگ میں تیغ آزمائی اور سپر نمائی میں مصروف رہتے ہیں۔ ان بے خبروں کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ ادیب استعاروں اور علامتوں میں بات کرتے ہیں۔ سحر انصاری نے میدانِ جنگ کی جو بات کی ہے تو اس سے مراد ادبی تقریبات ہیں۔ سحر انصاری کا زیادہ وقت کتابوں اور ادیبوں کی رونمائیوں میں گزرتا ہے۔ ان تقاریب میں شرکت کرنا اور میدانِ جنگ میں مصروفِ عمل ہونا ایک ہی بات ہے۔ صاحبانِ تقاریب کی فرضی تعریفیں کرنا، کسی اور سے نہ سہی اپنے آپ سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ سحر انصاری اپنی مرضی سے نہیں، دوسروں کے اصرار پر اُن کی تعریفیں کرتے ہیں۔ دوسرے انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں اور وہ دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصرار و انکار کی اسی کشمکش کو حالتِ جنگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی جنگ کے دوران جو تھوڑا سا فرصت کا وقت ملتا ہے، اس میں سحر انصاری لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ انھی کی ہمت ہے کہ ایسا کرتے ہیں، ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا لکھنے پڑھنے کے کام سے دستبردار ہو چکا ہوتا۔

پروفیسر عتیق احمد ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ اگرچہ یہ طے نہیں ہو سکا کہ ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ ہے یا ان کے قارئین کی، لیکن یہ طے ہے کہ وہ ہمارے ان چند نقادوں میں سے ہیں جو لکھنے سے پہلے ہی نہیں لکھنے کے بعد بھی سوچنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ لکھنے سے پہلے وہ اس لیے سوچتے ہیں کہ انھیں کیا لکھنا چاہیے اور لکھنے کے بعد یہ سوچتے ہیں کہ وہ کیا لکھ گئے۔ سوچنے کے دوسرے عمل میں ان کے قارئین بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ سماجیات کی اصطلاح میں "اجتماعی سوچ" اسی عمل کا نام ہے۔

پروفیسر صاحب نے بتایا ہے کہ وہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا ان کی معاشرتی ذمہ داری ہے۔ اس سے ان کا ذمہ دار ہونا تو ثابت ہو جاتا ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ذمہ داری انھیں کس

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نے سونپی ہے۔ ہمارے ان کے بہت گہرے دوستانہ مراسم ہیں، لیکن ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کبھی ان سے اس قسم کی درخواست کی ہو۔ بہر حال یہ ایک ضمنی بحث ہے، اصل بات یہ ہے کہ موصوف ادب کو بھی عام اشیائے صرف میں شمار کرتے ہیں، یعنی جس طرح دال، نمک اور آٹا معاشرے میں اہمیت رکھتے ہیں، اسی طرح ادب کی بھی ایک اہمیت ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان کا فلسفہ ادب انھی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں:

"جس طرح زندگی میں عام اشیا کی افادیت اور خوبیوں یا خامیوں کے متعلق ہم ایک دوسرے کو باخبر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں..... (اسی طرح) ادب پڑھنا اور اس کے متعلق اپنی رائے سے دوسروں کو آگاہ کرنا بھی ایک سماجی ذمہ داری ہے اور اس کی ادائی ایک فرض ہے..... بس انھی عناصر اور عوام کو پیش نظر رکھ کر ادب پڑھتا ہوں اور پھر جو بُری بھلی رائے قائم ہوتی ہے، اسے قارئین ادب کے سامنے پیش کر دیتا ہوں..... اپنی رائے عام کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ تخلیقی ادب و فن کی طرح تنقید ادب و فن بھی ایک معاشرتی ذمہ داری ہے۔"

ہمارے ملک میں ایک فیصد لوگ بھی ادب سے دلچسپی نہیں رکھتے جبکہ عام اشیائے صرف سے صد فیصد لوگوں کا تعلق ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے کتابوں کے بغیر زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن آٹے، دال اور نمک کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر پروفیسر صاحب کو ہم مشورہ دیں گے کہ اگر آپ اپنی معاشرتی ذمہ داری سے واقعی عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو پھر ادب جیسی نامعقول شے کی بجائے عام اشیائے صرف کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کیجیے تاکہ آپ کے علم و نظر سے پورا معاشرہ مستفید ہو سکے۔ آپ کو ایسے مضامین لکھنے چاہئیں جن سے عام شہری کو یہ معلوم ہو سکے کہ کس کمپنی کا تیار کردہ گھی صحت کے لیے مفید ہے اور کس کا مضر۔ کس چکی کا آٹا صحت کو بناتا ہے اور کس کا بگاڑتا ہے۔ کس صابن سے چہرے کی رنگت نکھرتی ہے اور کس سے چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے یہ بتا بھی دیا کہ کون سا افسانہ اچھا ہے اور کون سا بُرا تو اس سے کسی کی صحت پر اچھا یا بُرا اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن عام اشیائے صرف کے حسن قبح پر بحث کرنے سے پوری قوم کی صحت پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ امید ہے پروفیسر صاحب ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور اپنے تنقیدی موضوعات میں تبدیلی کے بارے میں سوچیں گے۔

احمد ہمدانی کراچی کے ان دو چار اہل قلم میں سے ہیں جن کی ثقاہت کی قسم کھائی جا سکتی

ہے۔ ادب سے ان کا تعلق اس درجہ مخلصانہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس نمود و نمائش سے سروکار نہیں رکھا جس کے بغیر آج کل ادب اور ادیب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ادبی گروہ بندیوں سے بے نیاز ہو کر ایک گوشے میں بیٹھے شاعری اور تنقید لکھتے رہتے ہیں۔ جسے یہ سب کچھ پڑھنا ہوتا ہے، وہ اسی گوشے میں جا کر پڑھ آتا ہے۔ غالب نے کہا تھا: "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا"۔ یہ مصرع خود غالب پر صادق نہیں آتا کہ اس کی ساری زندگی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا میں گزری۔ شاید یہ مصرع اس نے احمد ہمدانی کے لیے کہا تھا کہ وہی ایک ہمارے شہر میں ستائش اور صلے سے بے نیاز ہیں۔ انتباہ: غالب کے مذکورہ مصرعے کے ساتھ یہ مصرع بھی چسپاں ہے: "نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ احمد ہمدانی پر غالب کے پورے شعر کو منطبق نہ کیا جائے کیونکہ ان کے اشعار بامعنی ہی نہیں بامزہ بھی ہوتے ہیں۔

احمد ہمدانی کیوں لکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

"میرے لیے زندگی کی بہت سی مجبوریوں میں سے ایک مجبوری شعر کہنا بھی ہے۔ میری شخصیت اپنے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہے اور جب اس کی بے چینی حد سے گزر جاتی ہے تو مجھ سے کبھی شعر سرزد ہونے لگتے ہیں اور کبھی یہ بے چینی مجھے نثر لکھنے پر مائل کر دیتی ہے۔ شخصیت کے اظہار کا یہ تقاضا خود کو معاشرے میں اور معاشرے کو خود میں دیکھنے دکھانے کے عمل پر منتج ہوتا ہے۔"

ایسی حکمت کی باتیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ ہمارے عام شعرا جو کچھ لکھتے ہیں، وہ شاعری نہیں شاعری کی معذرت ہوتی ہے۔ گویا شاعری سے ان کی معذوری کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن احمد ہمدانی کی شاعری ان کی مجبوری ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام آدمی کی طرح شاعر بھی مجبور محض ہوتا ہے۔ افسوس کہ مجبوری میں آدمی کو کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ شعر کہنے کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ خدا کسی کو اتنا بھی مجبور نہ کرے!

احمد ہمدانی کے نزدیک مجبوری کے علاوہ شاعری کا ایک سبب طبیعت کی بے چینی بھی ہے۔ جس طرح درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا، اسی طرح بے چینی حد سے گزر جائے تو شعر سرزد ہوتے ہیں۔ یہ تو سنا تھا کہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں یا جرائم سرزد ہوتے ہیں، اب احمد ہمدانی کی عنایت سے یہ معلوم ہو گیا کہ شعر بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ احمد ہمدانی نے شاعر اور معاشرے کے باہمی تعلق کی بات بھی شاید اسی لیے کی ہے کہ اول الذکر سے شعر سرزد ہوتے ہیں اور ثانی الذکر میں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

جرائم۔ جرم کا سزا سے تعلق تو بہت پرانا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ شعر بھی سزا ہی کی بدلی ہوئی کوئی صورت ہو۔ بہرحال یہ دقیقے فلسفیانہ خیالات ہیں جن کی گہرائی میں جانے سے ہم جیسے سطح بینوں کے ڈوبنے کا احتمال ہے، لہٰذا ہم اس بحث کو ختم کرتے ہوئے احمد ہمدانی کے خیالات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک شاعر اپنی بے چینی معاشرے میں منتقل کردیتا ہے اور اس کے عوض معاشرہ اپنی خرابیوں کو شاعر کے حوالے کردیتا ہے تاکہ ان خرابیوں کی اصلاح ہوسکے۔ بے چینی ہو یا خرابیاں، دونوں باقی رہتی ہیں، بس ذرا ان کی جائے وقوع بدل جاتی ہے۔

منظر علی خاں منظر کے تذکرے سے یہ کالم شروع ہوا تھا، اسی لیے انھی کے ذکر خیر پر اسے ختم کیا جاتا ہے۔ یہ کالم ہی کیا، ہر سنجیدہ بحث ان کے ذکر پر ختم ہوسکتی ہے کہ وہ مزاح لکھنے والوں ہی میں نہیں، مزاح پیدا کرنے والوں میں بھی سرفہرست ہیں۔ انھوں نے ''میں کیوں لکھتا ہوں'' کا جواب مزاحیہ انداز میں دینا شروع کیا تھا لیکن مضمون کے آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصے سنجیدہ ہو گئے۔ اتنے سنجیدہ کہ سچ بولنے میں بھی انھیں کوئی تکلف نہ ہوا۔ انھوں نے فرمایا، میں غزل اس لیے لکھتا ہوں کہ بیوی مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کی بیگم صاحب بھی سخن فہم ہیں۔ منظر صاحب کی غزلوں کو دیکھ کر تمام سخن فہموں کا یہی ردعمل ہوتا ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ نثر میں بہترین مزاح نگاری کرنے والے کو اس کی غزل کی داد مزاح کے حوالے سے دینی چاہیے یا نہیں۔

منظر صاحب ہائیکو بھی لکھتے ہیں۔ اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ہر سال جاپانی سفارت خانے میں ہائیکو مشاعرہ ہوتا ہے جس میں شرکت کا معاوضہ ملتا ہے اور جاپانی قونصل جنرل مشاعرے کی فلم بناتے ہیں۔ ان کا کیمرہ اتنا عمدہ ہے کہ شاعروں کے چہروں کی تمام جھریاں غائب کردیتا ہے۔ منظر صاحب کو اس مشاعرے میں شرکت کرتے رہنا چاہیے۔ انشاء اللہ ایک دن آئے گا کہ جاپان والے ایسا کیمرہ ایجاد کرلیں گے جو شاعروں کے کلام کی بھی ساری جھریاں غائب کردے گا۔

ادب وثقافت کا رُستمِ زماں

کیا عجیب زمانہ آگیا ہے کہ ہم خود کوئی اچھا کام کرتے ہیں نہ کسی کو کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ بے چارے فخر زماں ہی کو دیکھیے کہ ادھر انھوں نے ثقافتی پالیسی کا اعلان کیا اور اُدھر یار لوگوں نے پہلے تو اس میں کیڑے ڈالے اور پھر کیڑے نکالنے شروع کردیے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ اس پالیسی کو شرمندۂ عمل کرنے کے لیے کروڑوں روپوں کی ضرورت ہوگی، یہ کہاں سے آئیں گے؟ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پالیسی پر مکمل عملدرآمد کے لیے عمر نوح درکار ہوگی۔ کیا کسی حکومت کا اتنے طویل عرصے تک برسرِ کار رہنا ممکن ہوگا؟

اگرچہ ان اعتراضات کا جواب دینا ادب وثقافت کے کسی رستم زماں کا کام ہے، مگر ہم خلقِ خدا کے فائدے کے لیے ان اعتراضات کو رد کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے عرض کریں گے کہ جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے یہ کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ کسی بھی حکومت کے لیے اور خاص طور پر موجودہ حکومت کے لیے روپے کی کمی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ زمانہ گیا جب سونے کے ذخائر کی بنیاد پر نوٹ جاری کیے جاتے تھے، اب اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نوٹ چھاپنے والی مشینیں ہی سونے کے ذخائر کا نعم البدل بن چکی ہیں۔ جو حکومت ثقافتی طائفوں اور گھوڑوں کے ایکسٹینشن اسطبلوں پر کروڑوں روپے صرف کرکے مارے خوشی کے جامے سے باہر ہوسکتی ہے، اس کے لیے ثقافتی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا کون سا مشکل کام ہے۔

دوسرا اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ کم فہمی بلکہ کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنا کہ ثقافتی پالیسی پر عملدرآمد کے لیے عمر نوح درکار ہوگی، محض ایک شاعرانہ انداز بیان ہے۔ اس بیان کو مزید شاعرانہ بنایا جاسکتا تھا، اگر نوح کی بجائے پسر نوح کا حوالہ دیا جاتا۔ مگر عملی زندگی میں شاعرانہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

موشگافیوں سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فخر زماں کی ثقافتی پالیسی کی عملی تشکیل میں زیادہ سے زیادہ پچاس برس صرف ہوں گے۔ قوموں کی زندگی میں پچاس برس کی مدت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اس سے کم مدت میں اس سے کہیں بڑے کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے پچیس برس سے بھی کم مدت میں اپنے ملک کو دولخت کر دیا ہو، ان کے لیے پچاس برس کے عرصے میں ثقافتی پالیسی کو خیال سے عمل میں لانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

ممکن ہے یہاں معترضین یہ سوال کریں کہ کیا موجودہ حکومت آئندہ پچاس برسوں تک سیاہ وسفید کی مالک رہے گی؟ ہم نجومی تو نہیں کہ پیش گوئی کر سکیں، البتہ آثار کچھ ایسے ہیں کہ موجودہ حکومت قیامت تک سیاہ وسفید کی مالک رہے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ قیامت آنے والے چند ہفتوں یا مہینوں میں برپا ہو جائے۔

گزشتہ چند ہفتوں میں متعدد ادیبوں اور دانش وروں نے روزنامہ "جنگ" کراچی میں ثقافتی پالیسی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اخفائے خیال سے کام لیا ہے کہ یہی مصلحت اندیشی کا تقاضا تھا۔ فخر زماں ایک درجن سے زیادہ علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کے سربراہ ہیں۔ اکادمی ادبیات بھی ان کے حبالۂ صدارت میں ہے۔ اہل قلم کانفرنس میں شرکت ادیبوں اور دانش وروں کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعزاز سے محروم ہونے کا خطرہ کوئی مول نہیں لے سکتا۔ تاہم بعض ادیبوں نے ثقافتی پالیسی پر بے ضرر قسم کی تنقید بھی کی ہے جو دراصل تائید ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ لیکن بزرگ ادیب شوکت صدیقی نے تو کمال ہی کر دیا ہے، انھوں نے ڈاکٹر حنیف فوق سے گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسی باتیں کہہ دی ہیں کہ کوئی دوسرا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

شوکت صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس کی سنگینی اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ وہ موجودہ برسر اقتدار سیاسی جماعت کے حلیفوں میں سے ہیں۔ ایک عرصے تک وہ اخبار "مساوات" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر شوکت صاحب ہر طرح کے فوائد اٹھا سکتے تھے مگر انھوں نے کبھی کوئی اعزاز لینا گوارا کیا نہ اپنے نام وظیفہ جاری کرایا۔ یہی نہیں، بھٹو کے زوال کے بعد مارشل لاء کے زمانے میں انھیں بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ وہ ہر قسم کی سختیاں سہتے اور پیپلز پارٹی کے حق میں دعائے

خیر کرتے رہے۔ جب یہ پارٹی برسر اقتدار آئی تو توقع تھی کہ شوکت صاحب کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں، ان کی تلافی کے طور پر، سرکاری سطح پر ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا، لیکن انھیں کوئی ستارۂ امتیاز ملا نہ پرائڈ آف پرفارمنس۔ حالانکہ اس دور میں ایسے ایسے لوگوں کو نوازا گیا جن کی "ادبی" خدمات انعام کی بجائے جرمانے کی مستحق تھیں۔

پاکستان کے بیشتر ادیب اپنی غیر ادبی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی موجودگی ثابت کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ ادب کا نہیں، ادب کے نام پر غیر ادبی مہم جوئی کا دور ہے۔ وہ دو چار ادیب جو صرف تخلیقی سطح پر زندہ ہیں، ان میں شوکت صدیقی بھی شامل ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے، ہر طرح کے صلے اور ستائش سے بے نیاز ہو کر ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اس خدمت کا عالمی سطح پر اس طرح اعتراف کیا گیا ہے کہ ان کے ناول "خدا کی بستی" کا دنیا کی تقریباً ڈیڑھ درجن زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں کم از کم ایک ادیب تو ایسا ہے جسے عالمی سطح پر پہچانا جاتا ہے۔

ثقافتی پالیسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے شوکت صاحب نے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے اور بڑی مزے مزے کی باتیں کی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے ثقافتی پالیسی پیش کرنے والے پنجابی زبان کے ادیب فخر زماں کے بارے میں کہا ہے:

"یہ کہا جانے لگا ہے کہ وہ ادب کی بڑی نامور شخصیت ہیں۔ لیکن میں نے ان کا چھوٹا سا ایک مجموعہ دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کیا کیا ہے، میں اس سے واقف نہیں، حالانکہ میں پنجابی زبان سے خاصا واقف ہوں۔"

حیرت ہے کہ شوکت صاحب ایک طرف تو پنجابی زبان سے واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف انھیں وارث شاہ اور بلھے شاہ کے درجے کے قلم کار کے ادیب ہونے میں بھی شبہ ہے۔ یہی نہیں، انھیں اس پر بھی اعتراض ہے کہ فخر زماں کو ادب کی نامور شخصیت کیوں کہا جاتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب لوگ کچھ لکھے بغیر ادب کی نامور شخصیات بن جاتے ہیں، فخر زماں لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے کم از کم ایک ایسی کتاب تو لکھ دی ہے جو شوکت صاحب جیسے جید ادیب کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اس بنا پر فخر زماں کا نامور ہونا ہی نہیں، مستند ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

شوکت صاحب مزید فرماتے ہیں:

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ (فخر زماں) کچھ کام کرتے لیکن کام تو کچھ ہوا نہیں، فخر زماں کے اعزاز میں تقاریب ہو رہی ہیں۔ جہاں کہیں تقریب کا اہتمام کیا گیا، وہاں انھوں نے تقریر کی اور ان کی تقریریں ٹیلی ویژن پر دکھائی گئیں۔ ریڈیو پاکستان پر اُن کی آواز آتی رہی۔ ٹیلی ویژن پر جلوہ دکھانا اور ریڈیو پر آواز سنانا اور اخبارات میں تصویریں چھپوانا ہی مقصود ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

ہم نہایت ادب کے ساتھ شوکت صاحب سے یہ پوچھیں گے کہ اگر تقاریب میں تقریریں کرنے، ٹیلی ویژن پر جلوہ فرما ہونے، ریڈیو پر صدا کاری کے جوہر دکھانے اور اخبارات میں تصویریں چھپوانے کا شمار کاموں میں نہیں ہوتا تو پھر وہ کون سے انسانی اعمال و افعال ہیں جنھیں ''کاموں'' میں شمار کرنا چاہیے۔ دراصل شوکت صاحب پرانے زمانے کے آدمی ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ نام و نمود سے بے پروا ہو کر سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ جبکہ نئے زمانے کا تقاضا ہے کہ جو کچھ کیا جائے نام و نمود کے لیے کیا جائے۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر ادب تخلیق کرنا بہت آسان ہے لیکن ہر روز مختلف تقاریب میں ایک جیسی تقریریں کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

شوکت صاحب نے فخر زماں سے اپنے ذاتی تعلق کے حوالے سے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جو انھی کے الفاظ میں یوں ہے:

''فخر زماں سے میری پہلی ملاقات پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے رائٹرز گلڈ کے خلاف ایک بہت بڑی چارج شیٹ تیار کر کے ذوالفقار علی بھٹو کو پیش کی۔ اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھیجی گئی۔ میں نے اسے پڑھا۔ اس میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ رائٹرز گلڈ ایک آمر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ میری بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ بھئی یہ رائٹرز گلڈ کیا ہے؟ یہ تو ایوب خان کی نگرانی میں بنائی گئی تھی۔ میں نے انھیں بتایا، جناب آٹھ برس تک آپ بھی ایوب خان کے ساتھ رہے ہیں، آپ مجھے بتایے کہ ایوب خان کو علم و ادب سے کتنا لگاؤ تھا؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ایوب خان ایک شعر بھی موزوں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہ ادارہ ادیبوں کے لیے کچھ کام کر رہا ہے۔ جو ادیب انتقال کر جاتے ہیں، ان کے اہلِ خانہ کے لیے فوری طور پر کچھ امداد کرتا ہے۔''

فخر زماں نے رائٹرز گلڈ جیسے بے ضرر ادارے پر وہ الزام لگایا جو اہلِ نظر خود ذوالفقار علی بھٹو

پر لگاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ انھیں الزام لگاتے وقت یہ خیال بھی نہ آیا کہ جو ادارہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ کسی دوسرے کے ہاتھ کیسے مضبوط کر سکتا ہے۔ شوکت صاحب نے الزام کی تردید میں جو دلیل دی ہے، وہ بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ایوب خان ایک شعر بھی موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ خود رائٹرز گلڈ کے بے شمار اراکین کا یہی حال تھا کہ انھیں موزوں اور ناموزوں کا فرق معلوم نہیں تھا۔ کیا اس بنا پر رائٹرز گلڈ سے ان کی بے تعلقی ثابت کی جا سکتی ہے؟

شوکت صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ رائٹرز گلڈ کا اصل مقصد ادیبوں کے پس ماندگان کی مالی مدد کرنا تھا۔ اسی لیے تو اس زمانے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ رائٹرز گلڈ ادیبوں کے لیے نہیں، ان کے پس ماندگان کی فلاح و بہبود کے لیے بنایا گیا ہے۔ اکثر ادیب گلڈ سے ناخوش رہتے تھے لیکن ان کے پس ماندگان کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ مالی امداد کے مقررہ وقت کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور اس انتظار میں انھیں رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔

رائٹرز گلڈ کی طرف سے ادیبوں کی تجہیز و تکفین کے لیے بھی معقول رقم دی جاتی تھی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مشہور شاعر نے ایک مرتبہ گلڈ کو درخواست دی تھی کہ میرے انتقال کے بعد تجہیز و تکفین کے لیے جو رقم دی جائے گی، وہ میری زندگی ہی میں ادا کر دی جائے تاکہ میں مرنے سے پہلے زندگی کے چند روز آرام سے گزار سکوں۔ گلڈ والوں نے یہ درخواست مسترد کرتے ہوئے درخواست گزار کو لکھا تھا: ''آپ کی زندگی تو جیسے تیسے گزر ہی جائے گی، ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا مردہ بھی خراب ہو۔''

گلڈ نے یہ سلوک اس شاعر سے کیا تھا جس کا یہ شعر ایک زمانے میں بہت مشہور تھا:

بوالہوس سامنا کس منہ سے کرے گا میرا
ایسے ویسے پہ تو مردہ بھی مرا بھاری ہے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

''جو رہی سو بے خبری رہی''

ادا جعفری کی کتاب ''جو رہی سو بے خبری رہی'' دیکھ کر ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ یہ محترمہ کا تازہ مجموعۂ کلام ہوگا۔ ان کا آخری مجموعہ ''ساز سخن بہانہ ہے'' بارہ تیرہ برس پہلے چھپا تھا، اس عرصے میں انھوں نے بہت سی شاہکار نظمیں غزلیں لکھیں، اس لیے تازہ مجموعے کی اشاعت غیر متوقع نہیں تھی۔ کتاب کی ورق گردانی سے پہلے اس کے نام نے مسحور کر دیا کہ کسی شعری مجموعے کے لیے ایسا موزوں اور خوب صورت نام کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ بڑے شوق سے کتاب کھولی، لیکن افسوس کہ اس میں سے نظم کی بجائے نثر برآمد ہوئی۔ مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب اندرونی سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے قوسین میں ''خود نوشت'' لکھا دیکھا۔ ایک تو شاعروں کی نثر پڑھنا ہمارے لیے مشکل کام ہے، اور اس سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ کسی ایسی شخصیت کی آپ بیتی پڑھی جائے جس کی زندگی میں کسی چٹخارے دار واقعے کے رونما ہونے کا امکان ہی نہ ہو۔ جس نے امرتا پریتم، اجیت کور اور کشور ناہید کی آپ بیتیاں پڑھی ہوں وہ ادا جعفری کی آپ بیتی اسی وقت پڑھے گا، جب اسے ثواب حاصل کرنا ہوگا۔ سو ہم نے اس کتاب کو ان کتابوں کے ساتھ رکھ دیا جن کو آئندہ زندگی میں حصول ثواب کے لیے پڑھنے کا ارادہ ہے۔

گزشتہ ہفتے سورج گرہن والے دن پورے شہر کی طرح ہم بھی خوف زدہ تھے، گھر سے باہر قدم نکالنے کی ہمت نہ ہوئی تو سوچا کوئی نیکی کا کام ہی کر لیا جائے۔ اس لمحے ادا جعفری کی کتاب یاد آئی کہ اس کے مطالعے سے زیادہ نیکی کا کوئی کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ کانپتے ہاتھوں میں ہم نے کتاب سنبھالی اور آئندہ زندگی میں نیک راہ پر چلنے کی دعا مانگ کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پہلے صفحے کی پہلی سطر ہی ایسی دامن کش دل ہوئی کہ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اسے

پڑھتے رہے اور جب تک کتاب ختم نہ ہو گئی، ہم نے اسے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی اس رائے پر ندامت ہوئی، جو ہم نے کتاب پڑھنے سے پہلے قائم کی تھی۔ حالانکہ ہماری روایت یہ رہی ہے کہ کتابیں پڑھے بغیر ہی ان کے بارے میں کالم لکھے ہیں اور الحمدللہ کہ کبھی کوئی غلط بات نہیں لکھی۔ ادا جعفری کی کتاب پڑھنے کے بعد اب ہماری یہ رائے ہے کہ اسے سورج گرہن کے دن ہی میں نہیں، عام دنوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایسی دلچسپ اور اعلیٰ ادبی معیار کی کتابیں کم لکھی گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادا جعفری کی زندگی میں کوئی چٹخارے دار واقعہ، کوئی سنسنی خیز قصہ اور کوئی دل گرما دینے والا رومان رونما نہیں ہوا، اس کے باوجود یہ کتاب قاری کے دل کو گرماتی ہے اور ذہن کو روشنی بھی عطا کرتی ہے۔

ادا جعفری نے ہر حساس انسان کی طرح دو سطحوں پر زندگی بسر کی ہے، وہ بیک وقت دو دنیاؤں کی شہری ہیں۔ ایک دنیا تو وہ ہے جو گرد و پیش کے ماحول نے تعمیر کی ہے اور دوسری دنیا وہ ہے جو اُن کی ذات کے اندر واقع ہے۔ وہ اپنی زندگی کی روداد بیان کرتے ہوئے کبھی ظاہری دنیا کی تصویریں دکھاتی ہیں اور کبھی باطنی دنیا کے مناظر پیش کرتی ہیں۔ کہیں وہ بھولے بسرے واقعات سناتی ہیں اور کہیں اپنی ان سوچوں اور خیالوں کی نقش گری کرتی ہیں جو زندگی کے مختلف ادوار میں ان کے دل و دماغ پر مسلط رہے۔ اس اعتبار سے یہ آپ بیتی منفرد ہے کہ اس میں عام واقعات کے ساتھ دل و دماغ پر گزرنے والی کیفیات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس نے آج کے عہد کی ایک بڑی شاعرہ بننے تک کے مراحل کس طرح طے کیے، ان کی تفصیل تو اس کتاب میں ملتی ہی ہے، لیکن جو چیز اس کتاب کو عام کتابوں سے الگ کرتی ہے، وہ مصنفہ کا انداز بیان ہے۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی اچھا شاعر، اچھی نثر لکھنے پر بھی قادر ہو۔ اسی طرح اگر کوئی اچھا نثر نگار، شاعر بھی ہو تو اس سے اچھی شاعری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ غالب کا شمار تو مستثنیات میں ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت بڑا شاعر بھی ہے اور بڑا نثر نگار بھی۔ لیکن دوسرا کوئی شاعر یا نثر نگار ایسا نہیں ملتا جو نثر و نظم دونوں میں باکمال ہو۔ شاعروں میں علامہ اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہ بڑے شاعر ہیں مگر ان کی نثر بے مزہ ہوتی ہے، یہی حال فیض کا ہے کہ ان کی شاعری کے سامنے ان کی نثر خانۂ بے چراغ ہے۔ ہمارے صاحب طرز نثر نگاروں میں

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری شاعری سے بھی شوق رکھتے تھے۔

مولانا آزاد کا خاصا کلام منظرِ عام پر آچکا ہے اور نیاز فتح پوری کا شمار تو زود گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا وہ کلام جو ستر اسی سال پہلے کے رسالوں میں دفن ہے، جمع کیا جائے تو ہزار صفحوں سے کم مجموعہ مرتب نہیں ہوگا، لیکن آزاد اور نیاز کی نثر کے سامنے ان کی شاعری کا وہی حال ہے جو کمال کے بالمقابل عجز کا۔ موجودہ دور میں ایک بھی نثر نگار ایسا نہیں ہے جس نے ڈھنگ کے دو مصرعے لکھے ہوں، لیکن شاعروں میں چند ایسے ضرور مل جاتے ہیں، جنھیں نثر لکھنی آتی ہے۔ اس مختصر گروہ میں ادا جعفری اس اعتبار سے منفرد نظر آتی ہیں کہ ان کی نثر صحیح معنوں میں تخلیقی نثر ہے، وہ اب تک ہمارے عہد کی ایک بڑی شاعرہ تھیں، زیرِ نظر کتاب کی اشاعت کے بعد اب وہ بڑی نثر نگار بھی ہیں۔

اگر یہاں تخلیقی نثر اور غیر تخلیقی نثر کا فرق واضح کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر لکھنے والے کی پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اپنا مدعا بیان کرے اور یہ کام ہر وہ شخص بآسانی انجام دے لیتا ہے جس کے ہاتھ میں قلم اور قلم کے سامنے کاغذ کے سامنے کاغذ ہو۔ کوئی لفظوں کو بے جان اشیا کی طرح استعمال کرتا ہے اور کوئی ان کو جاندار سمجھ کر ان کی روح میں اترتا ہے اور معانی کا سراغ لگاتا ہے، کوئی اپنا مدعا اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا پڑھ کر بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا پڑھا تھا اور کوئی اپنی بات اس طرح کہتا ہے کہ بات ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور بات کہنے کا انداز دل میں گھر کر لیتا ہے۔

ادا جعفری کی نثر اس لیے تخلیقی ہے کہ انھوں نے لفظوں کو انسانوں کی طرح جاندار سمجھا ہے اور ان کی ماورائے لغت معنویت سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی باتیں اچھے شعر کی طرح نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ یاد بھی رہ جاتی ہیں۔ کتاب کا آغاز ہی اس خوبصورت انداز سے ہوتا ہے:

"وہ جو بے چین اور بے خبر اور ہجوم میں تنہا لڑکی تھی، یہ اس کی اور میری کہانی ہے، میرے اور اُس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا صبح و شام کے بیچ آجاتا ہے۔ میرا اور اُس کا وہی رشتہ ہے جو سوچ کا آواز سے ہوتا ہے۔ سوچ کی سرحدیں نہیں ہوتیں، آواز حدود میں گرفتار رہتی ہے، آواز سوچ کے ساتھ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی وہ میرے پاس ہوتی ہے کبھی صدیوں کے فاصلے پر۔ میں تو اسے بہت پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھی تھی مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مڑ کر دیکھ لینے

میں حرج ہی کیا ہے۔ بدلتے موسموں کی دل داری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لیے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھو لینا بھی اچھا ہے۔"

اگر اس اقتباس کے جملے، مصرعوں کی طرح لکھے دیے جائیں تو یہ عبارت ایک خوبصورت نثری نظم میں تبدیل ہو جائے گی۔ ایسے ہی دل کو چھو لینے والے "شعر" اس کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر ملتے ہیں۔ ان میں کچھ "شعر" سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

"وہ بی بیاں واقعی چراغ کا نہ تھیں، طاق میں رکھے ہوئے دیے کو اپنے ہی اُجالے کے لیے کسی اور ہاتھ کا منتظر رہنا پڑتا ہے کہ جب چاہا جلا لیا، جس کو چاہا بجھا دیا اور پھر بجھے ہوئے چراغ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے، وہ آنسو جو آنکھ سے دل میں ٹپکا کس نے دیکھا ہے۔"

"کتابِ ذات کو کھول کر پڑھا جائے، کہاں ممکن ہے، اس کے اوراق تو تند شوریدہ سر ہواؤں میں اتنی تیزی سے پلٹ رہے ہیں کہ کہیں کسی صفحے کا ایک لفظ، کسی ورق کی ایک سطر ہی پلٹے پڑ جائے تو بہت ہے۔"

"عورت ایک ہی مہلتِ حیات میں کئی جیون جھیلتی ہے۔ قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے آداب کچھ کہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملنے کے راستے کہیں اور نکلتے ہیں۔"

اس آپ بیتی کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مصنفہ نے اپنے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات بھی بیان کیے ہیں، خصوصاً غیر ملکی اسفار کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ملتا ہے، لیکن ان میں روایتی سفرناموں والی کوئی بات نہیں ہے۔ سفر کے انھی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے جو مصنفہ کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث تھے، اس حیرت و استعجاب میں قاری بھی برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کو شخصیات کا نگار خانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بلا مبالغہ سو ڈیڑھ سو افراد کا ذکر ہے، لیکن کسی کے بارے میں بھی چند سطروں سے زیادہ نہیں لکھا۔ اس کے باوجود کوئی اہم بات

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

لکھنے سے نہیں رہ گئی۔ چند سطروں ہی میں موضوع کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ شخصیت نگاری کے حوالے سے اختصار اور جامعیت کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی دوسری جگہ نظر آئے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے وہ چند سطریں نقل کی جاتی ہیں، جو ممتاز مفتی کے بارے میں ہیں:

''مفتی جی ادب کا اتھاہ ساگر ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ وقت کی حدود سے آزاد ہیں۔ مختصر افسانے کے ابتدائی دور میں بھی ادیبوں کی پہلی صف میں موجود تھے اور آج جدید ترین افسانہ نگاروں کے گروہ کے سرخیل بھی وہی ہیں۔ وقت اپنا سایہ ان پر نہیں ڈال سکا ہے۔ ہم سب انھیں سن رسیدہ بیٹے کا نوجوان باپ کہتے تھے..... مجھے تو ایسا لگتا ہے وقت کے علاوہ مقام کی قید سے بھی وہ آزاد ہیں کہ آپ انھیں اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ان سے باتیں کر رہے ہیں، ان کی باتیں سن رہے ہیں اور عین اس لمحے وہ کہیں دور کسی برگد کی چھاؤں میں آنکھیں بند کیے کسی اور ہی سے محوِ تکلم ہیں۔ پہاڑوں پتھروں کے بیچ کھلے ہوئے کسی اکیلے پھول کی ابھی ابھی خوشبو کی آواز بھی سن رہے ہیں اور رم جھم برکھا میں کسی دیوداسی کی نرتکی کے راگ ملہار پر جھوم بھی رہے ہیں، اس بھید کو کون بوجھے!''

اس مختصر کالم میں کتاب کے جملہ محاسن کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم یہ عجیب و غریب بات لکھے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ پوری کتاب میں کوئی جملہ تو کیا، کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ حالانکہ آج کل کے بعض مصنفین تو پوری پوری کتابیں ایسی لکھ دیتے ہیں جن میں قارئین کی دل آزاری کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ آج دنیائے ادب میں قاری سے زیادہ مظلوم اگر کوئی ہے تو صرف وہ کاغذ ہے جس پر کتابیں چھپتی ہیں۔

اور آخر میں صہبا لکھنوی کا بے حد شکریہ کہ انھی کے پیہم تقاضوں کی وجہ سے یہ کتاب لکھی گئی۔ صہبا لکھنوی نے یوں تو بڑے بڑے ادبی کام انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے ادب کی تاریخ میں ان کی جگہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکی ہے، لیکن ادا جعفری سے یہ کتاب لکھوا کر انھوں نے ہم جیسے بندگانِ بے دام کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی ہے۔

دانشورانِ بے قلم

گزشتہ ہفتے ''نوائے وقت'' کراچی میں مسعود مفتی کا ایک فکر انگیز مضمون ''پاکستانی ادیب کے مسائل'' شائع ہوا ہے۔ اس کا ذکر ہم نے ایک دوست سے کیا جو شاعر ہیں اور ایک کالج میں اُردو ادب کے استاد بھی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ مضمون کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کریں گے یا کم از کم یہی پوچھ لیں گے کہ مضمون میں کیا لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے جو بات کہی وہ ایسی تھی کہ اس سے صرف یہی ثابت ہو سکا کہ اب عالمِ بالا کے سخن فہموں کو زمین پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ فرمایا، ممتاز مفتی کا نام تو سنا ہے مگر یہ مسعود مفتی کون ہیں؟ یہ سن کر ہم شرمندہ ہوئے اور سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکے کہ ''حیرت ہے کہ آپ نے ممتاز مفتی کا نام سن رکھا ہے۔'' وہ شرمندہ نہ ہوئے۔ کہنے لگے، ''آخر بتایئے تو سہی مسعود مفتی کون ہیں؟'' ہم نے بات ٹالنے کے لیے کہا، جب اُردو ادب کے ایک استاد ہی نے ان کا نام نہیں سنا تو پھر یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ وہ ادیب ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فرمایا، کتابیں لکھنے سے کیا ہوتا ہے، جب تک کوئی ادیب ٹی وی پر نہ آئے یا اخبار میں اس کا انٹرویو نہ چھپے، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آج کل کتابیں کون پڑھتا ہے۔

یہ تو اُردو ادب کے ایک استاد کا حال تھا اور اُردو کے نقادوں کا یہ حال ہے کہ اُردو افسانے پر تنقیدی مضامین لکھتے ہوئے انھیں ایک ایسے افسانہ نگار کا نام یاد نہیں آتا جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو تخلیقی سطح پر محسوس کر کے ''رگ سنگ'' اور ''ریزے'' جیسے افسانوی مجموعوں سے اُردو ادب کو باثروت بنایا۔ مشرقی پاکستان کے حوالے سے مسعود مفتی کی دو اور کتابیں بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں، ''چہرے'' اور ''لمحے''۔ پہلی ایک رپورتاژ ہے اور دوسری ذاتی ڈائری۔ ان دونوں میں مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کے چشم دید حالات بیان کیے گئے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہیں۔ مسعود مفتی مشرقی پاکستان میں اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے وہاں کے حالات کو دوسروں کی نسبت زیادہ قریب سے دیکھا، اور جو کچھ دیکھا اسے اس انداز سے سپرد قلم کیا کہ ان کی یہ دونوں کتابیں بیک وقت تاریخ اور ادب کا مرقع بن گئیں۔ ان کتابوں سے پہلے ان کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعے بالترتیب ''سرراہے'' اور ''محدب شیشہ'' کے ناموں سے چھپ چکے تھے۔ ایک ناولٹ ''کھلونے'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اتنی بہت سی اور اعلیٰ ادبی معیار کی کتابیں لکھنے والے ادیب سے اگر اردو کے استاد اور نقاد ناواقف ہیں تو اس میں قصور ان کا نہیں، خود لکھنے والے کا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا کام صرف کتابیں لکھنا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب ادیب کا کام صرف لکھنا ہوتا تھا۔ اب یہ کام ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ادیب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت خبر میں رہے اور نظر میں رہے۔ اور اگر یہ مقصد کچھ لکھے بغیر حاصل ہو سکے تو اور بھی اچھا ہے۔ مزاحمتی ادب والے اسی نسخے پر عمل کر کے ادیب کہلاتے ہیں۔

مسعود مفتی سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ اپنے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم یہ تو کر ہی سکتے تھے کہ دو چار رسالوں کے مسعود مفتی نمبر نکلوا دیتے۔ سادگی کی انتہا یہ ہے کہ ان سے اتنا سا کام بھی نہ ہو سکا۔ اسی سادگی کا اظہار ان کے اس مضمون سے بھی ہوتا ہے جس کا ذکر ہم نے کالم کے آغاز میں کیا ہے اور جس سے متاثر ہو کر ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

مسعود مفتی کے نزدیک پاکستانی ادیب کے سارے مسائل ایک ہی بنیادی مسئلے کے گرد گھومتے ہیں، اگر یہ بنیادی مسئلہ حل ہو جائے تو سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ادیب اپنے قلم سے روزی نہیں کما سکتا۔ فرماتے ہیں:

''ادیب کی ادبی کاوش اسے خود کفیل نہیں بناتی کیونکہ قانون کا موجودہ ڈھانچہ اسے مناسب تحفظ نہیں دیتا اور اس کی بالکل مدد نہیں کرتا۔''

اس اجمال کی تفصیل انھوں نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''ناشر مصنفین کے ساتھ واجبی سی رائلٹی کا معاہدہ کر لیتے ہیں جو شاذ و نادر ہی دس فیصد سے اوپر ہوتی ہے مگر نتیجہ اس کا بھی صفر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ زیادہ حالتوں میں وہ معاہدے کے باوجود مصنف کو ایک کوڑی بھی نہیں دیتے اور اگر دیتے ہیں تو ایک ہزار کتابوں کی رائلٹی جبکہ خود چوری چوری کئی

ہزار کتب چھاپ کر بغیر رائلٹی ادا کیے بیچتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کل فروخت کے تناسب سے مصنف کو ایک فیصد یا اس سے بھی کم رائلٹی ملتی ہے..... جو رقم مصنف کو دی جاتی ہے وہ تو مشتہر ہوتی ہے مگر جس رقم سے مصنف کو محروم رکھا جا رہا ہے وہ صیغۂ راز میں رہتی ہے۔ عین ممکن ہے اس رقم سے مصنف اپنے لیے چھوٹا سا آشیانہ بنا سکتا جو فی الحال ناشر کا فلک بوس محل بنانے میں صرف ہو رہی ہے۔''

مسعود مفتی نے علامہ راشد الخیری کے انداز میں نہایت عمدگی سے انتہائی اندوہ ناک صورتِ حال کی نشان دہی کی ہے۔ ایسی تصویر کشی کوئی مصورِ غم ہی کر سکتا تھا! مگر استاد لاغر مراد آبادی فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب نے بنیادی مسئلے کی بنیاد ہی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پاکستان کے نوے فیصد ادیب، اپنے قلم سے ادب تو تخلیق کر نہیں سکتے، روزی کیسے کما سکتے ہیں۔ جس قسم کی ''ادبی'' کتابیں پاکستان میں چھپتی ہیں، ان میں سے کتنی ایسی ہوں گی جو ادب کہلانے کی مستحق ہیں اور جو واقعی ادبی کتابیں ہیں، ان میں سے بیشتر کا پانچ سو یا ایک ہزار کا ایڈیشن کئی کئی سال تک خریداروں کے انتظار میں گودام میں پڑا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب عام آدمی کا مسئلہ نہیں ہے۔ جس ملک میں نوے فیصد عوام غیر تعلیم یافتہ ہوں اور ادب سے دلچسپی لینے والے ایک فیصد بھی نہ ہوں، وہاں کسی ادیب کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس کا قلم اس کے لیے روزی کا وسیلہ بنے گا۔ پاکستان کے ایسے ادیبوں کو جن کی کتابیں ایک ہزار سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنا جائے تو دو تین انگلیاں شمار ہی میں نہیں آئیں گی۔ کتابوں کی کسی بھی دکان پر چلے جائیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ جو کتابیں خریدتے ہیں، ان کی اپنی ترجیحات ہیں۔ اگر کسی دکان میں دن بھر میں سو خریدار آتے ہیں تو ان میں سے نوے خریدار، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور عام معلومات کی کتابیں خریدتے ہیں۔ باقی دس خریداروں میں سے سات خریدار اے آر خاتون، رضیہ بٹ اور نسیم حجازی جیسے مقبول عام ادیبوں کی کتابوں کے خواہاں ہوتے ہیں۔ صرف تین خریدار خالص ادب کے حصے میں آتے ہیں۔ یہ تین خریدار ظاہر ہے کہ پاکستان کے تین ہزار سے زیادہ ادیبوں کے لیے روزی کا وسیلہ نہیں بن سکتے۔

استادِ گرامی نے مزید فرمایا:

''پاکستان کے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود چھاپتے ہیں یا پھر وہ پبلشر کو اخراجاتِ طباعت کا بڑا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

حصہ ادا کر کے چھپواتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ پاکستان کے عام ادیبوں کی کتابیں چھاپنا منافع بخش کاروبار نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے بعض ناشروں کے فلک بوس محلوں کا ذکر کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض ناشروں نے محل بنائے ہیں، مگر ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ناشروں کے لیے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ کسی کتاب چھاپ رہے ہیں، اصل اہمیت اس کی ہے کہ وہ کس کے لیے کتاب چھاپتے ہیں۔ وہ جو کتاب بھی چھاپتے ہیں، وہ لائبریریوں کی زینت بن جاتی ہے۔ قیمتیں اسی لیے زیادہ رکھی جاتی ہیں کہ لائبریریوں کے لیے کتابیں خریدنے والوں کا ''نذرانہ'' بھی کتاب کی قیمت میں شامل ہوتا ہے۔ یہ کالا کاروبار ایک عرصے سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہماری قوم کی تعلیمی اور اخلاقی حالت بہتر نہیں ہوتی۔''

استاد لاغر مراد آبادی نے جو کچھ کہا ہے، اس پر مسعود مفتی شاید ہی غور فرمائیں کیونکہ ان کا خیال تو یہ ہے کہ:

''ادیب خود تو اپنی تحریر سے روزی نہیں کما سکتا مگر جب وہ لکھتا ہے تو کم از کم آٹھ افراد یا ادارے اس کی تحریر سے اپنی مکمل روزی کماتے ہیں۔ سب سے پہلے کاتب، دوسرا کاغذ فروش، تیسرا پریس والا مع اپنے تمام عملے کے، چوتھا وہ مزدور جو اُسے اٹھا کر ٹھیلے پر رکھتا ہے، پانچواں گاڑی بان جو مطبوعہ تحریر کو پریس سے منزل تک پہنچاتا ہے، چھٹا یا تو ڈاک کا محکمہ یا وہ کمپنی جو ٹرک کے ذریعے مطبوعات کو کتب فروش تک پہنچاتی ہے۔ ساتواں بک سیلر اور آٹھواں ناشر جو شروع سے آخر تک اس عمل کی نگرانی کرتا ہے اور وہ لوگ ان آٹھ کے علاوہ ہیں جو کسی نہ کسی طور طباعت اور ترسیل کے عمل میں شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً گتا، گوند، سیاہی اور رسّی بیچنے والے افراد۔ ان سب لوگوں کی روزی کا منبع وہ تحریر ہے جس کا معاوضہ اس تحریر کے لکھنے والے کو نہیں ملتا۔''

مفتی صاحب نے اگرچہ دنیا بھر کے ہنرمندوں، پیشہ وروں اور دکان داروں کی روزی کا منبع ادیب کی تحریر کو قرار دیا ہے، لیکن پھر بھی خاصا تکلف فرمایا ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی اور وسیع القلبی سے کام لیتے تو گوند، گتا اور رسّی بیچنے والوں کے ساتھ پان سگریٹ اور چائے بیچنے والوں کو بھی اس فہرست میں شامل کر سکتے تھے کیونکہ ان کا کاروبار بھی زیادہ تر ادیبوں ہی کی وجہ سے چلتا ہے۔ نیز مذکورہ بالا جتنے لوگ بھی کتاب چھاپنے اور بیچنے کے کام سے متعلق ہیں، وہ سب کام کے دوران پان، سگریٹ اور چائے سے شغف ضرور رکھتے ہیں۔

مفتی صاحب نے مزے کی ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ ادیب جب اپنے قلم سے روزی نہیں کما سکتا تو وہ اپنے فن اور تخلیق کا معیار بلند نہیں کر سکتا۔ کلمۂ حق ادا کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ:

''اس رزق کی تلاش پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے اس کی ادبی پرواز میں کوتاہی آ جاتی ہے۔ روزی کا تحفظ اس کی بنیادی ضرورت بن جاتا ہے اور قلم کا تقدس ثانوی ہو جاتا ہے۔ سچائی کی تلاش اور کلمۂ حق کی بجائے وہ کارآمد مصلحتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی آزادیٔ اظہار کو پاؤں تلے روند دیتی ہے۔''

مفتی صاحب کو اب یہ کون بتائے کہ کارآمد مصلحتوں کے پیچھے بھاگنا اور خوشامد اور چاپلوسی کا ہنر آزمانا، قلم چلانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ نظمیں، غزلیں اور افسانے لکھنے کے لیے تو صرف ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، دوسرے کاموں کے لیے ارادے کے ساتھ عمل بھی درکار ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک باعمل آدمی، بے عمل آدمی کے مقابلے پر معاشرے کے لیے زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ:

''ادیبوں کی بہبود کے نام پر جو ادارے بنائے جاتے ہیں، ان پر ناشر اور ان کے نمائندے قابض ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ادیب اس فورم سے بھی محروم ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنی آواز اُٹھا سکتا ہے۔''

مگر آج کل تو ان اداروں پر دانشورانِ بے قلم قابض ہیں۔ مفتی صاحب کو اگر تخلیقی کاموں سے فرصت مل جائے تو تھوڑی سی تحقیق کر کے صحیح صورتِ حال سے ہمیں آگاہ کریں کہ یہ دانشورانِ بے قلم ناشروں کے نمائندے ہیں یا پیپلز پارٹی کے۔

ادیبوں کے مسائل پر لکھتے لکھتے مفتی صاحب نے ادیبوں کے مطالبے بھی پیش کر دیے ہیں جو یہ ہیں:

- ۱۔ انھیں مکانوں کے لیے پلاٹ دیے جائیں۔
- ۲۔ بچوں کی تعلیم کے لیے وظیفے دیے جائیں۔
- ۳۔ بچوں کی شادیوں کے لیے گرانٹ دی جائے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

یہ مطالبے ہمیں تو اُدھورے نظر آتے ہیں۔ پلاٹ مانگے ہیں تو پلاٹ پر عمارت بنانے کے لیے رقم بھی مانگنی چاہیے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے وظیفے ضرور ملنے چاہئیں لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ خود ادیبوں کی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اکادمی ادبیات کے تحت تعلیم بالغاں کا شعبہ قائم ہونا چاہیے۔ بچوں کی شادیوں کے لیے گرانٹ ضرور ملنی چاہیے مگر ابھی تو بہت سے ادیب خود غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کی شادیوں کا انتظام بھی حکومت کو کرنا چاہیے۔

خدا کرے یہ سب مطالبات منظور ہو جائیں۔ خدا نہ کرے کہ مطالبات منظور ہونے کے بعد بھی ادیبوں کی تحریروں کا معیار وہی رہے جو اب تک رہا ہے۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

جنوری کی بارھویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن، ہماری طبیعت ناساز تھی اور منظر علی خاں منظر بیمار پرسی کے لئے آئے۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے اور اس ایک گھنٹے میں انہوں نے خلاف معمول جلدی جلدی اتنی باتیں کیں کہ اگر وہ اپنے معمول کے مطابق گفتگو کرتے تو باتوں کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک چلتا، اس تیز روی پر ہمیں خاصی حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی حیرت کا اظہار کرتے، وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے کہا، خان صاحب ایسی بھی کیا جلدی، آپ کو جو کچھ کہنا تھا، وہ آپ نے کہہ لیا ہمیں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ کہنے لگے، ان شاء اللہ اگلے جمعہ کو آؤں گا۔ اس وقت جلدی یوں ہے کہ آپ کو تو معلوم ہے میں ہر جمعہ کو والد مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے سخی حسن قبرستان جاتا ہوں، اس وقت وہیں جا رہا ہوں اور پھر جمعہ کی نماز میں بھی شامل ہونا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

اگلے جمعہ کو خان صاحب نے وعدہ خلافی کی اور ہم سے ملنے نہیں آئے۔ گھر سے سیدھے سخی حسن کے قبرستان چلے گئے۔ اکیلے نہیں، عزیزوں، دوستوں، ملاقاتیوں اور چاہنے والوں کا ایک ہجوم ان کے ساتھ تھا۔ ہر آنکھ پرنم تھی، لیکن خان صاحب کے چہرے پر وہی پرکشش مسکراہٹ تھی جو زندگی بھر ان کی پہچان رہی۔

مسکراہٹ کے بعد خان صاحب کی دوسری پہچان ان کا ٹیلی فون تھا۔ ہمیں یاد نہیں کہ گزشتہ سولہ برسوں کے تعلقات میں، سوائے ان دنوں کے جب وہ یا ہم کراچی میں نہ ہوں، کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ انہوں نے فون نہ کیا ہو۔ ضرورت سے تو سبھی فون کرتے ہیں، لیکن خان صاحب عادتاً فون کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وقت اور موضوع گفتگو کی کوئی قید نہیں تھی۔ کبھی تو گفتگو صرف سلام

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

دعا تک محدود ہوتی اور کبھی وہ دیر دیر تک باتیں کرتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید سے بھی فون پر ان کا رابطہ رہتا تھا، ان سے جو گفتگو ہوتی، اس سے مطلع کرتے۔ بعض ہندوستانی ادیبوں سے خط و کتابت رہتی تھی خصوصاً ڈاکٹر لطف الرحمٰن سے۔ ان لوگوں کو خطوط بھی فون پر سنا دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی تازہ غزل کے شعروں سے محظوظ کرتے اور اگر ہمارے گوش پر آواز ہونے کا یقین ہوتا تو کسی نئے مضمون کے دو تین پیراگراف بھی سنا دیتے۔ ایسے موقعوں پر ہم یہ کہتے، خان صاحب! مضمون ڈاک سے بھیج دیجئے، پڑھنے میں زیادہ مزا آئے گا۔ کہتے، مگر سنانے میں جو مزہ مجھے آ رہا ہے، وہ تو نہیں آئے گا۔

دسمبر کے تیسرے ہفتے میں وہ مسقط گئے تھے۔ وہاں عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں انہوں نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی، آخری ملاقات میں اس کانفرنس کی روداد مزے لے کر سناتے رہے۔ ہندوستان سے اکٹھے تین طنز و مزاح نگار آئے تھے، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ۔ پاکستان سے صرف آپ کا یہ بھائی تھا، پہلے تو میں ڈرا کہ ان تینوں کا اکیلے کیسے مقابلہ کروں گا، لیکن خدا نے عزت رکھ لی۔"

"کس کی، آپ کی یا ان تینوں کی" ہم نے خان صاحب کو چھیڑا۔ خان صاحب نے ہماری بات سنے بغیر اپنا بیان جاری رکھا۔ "مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم سے تو پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی جب وہ ۱۹۸۸ء میں پاکستان آئے تھے۔ دلیپ سنگھ سے مسقط میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی، بہت کمال کے آدمی ہیں۔ تحریر ہی سے نہیں، گفتگو سے بھی طنز و مزاح نگار معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم نے بات کاٹی۔ "یہ کوئی کمال نہیں، کمال تو یہ ہے کہ آدمی شکل و صورت سے مزاح نگار معلوم ہو۔"

اب کے خان صاحب نے ہماری بات سن لی۔ کہنے لگے۔ "آپ کا اشارہ میری طرف ہے۔" ہم نے عرض کیا۔ "ہرگز نہیں، آپ تو صورت سے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" ہنستے ہوئے خان صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "مسقط میں تین چار دن بہت اچھے گزرے، تینوں ہندوستانی ادیب بہت محبت سے ملے، وہ آپ کے کالموں کے حوالے سے مجھ سے خوب اچھی طرح متعارف تھے، ایک مرتبہ دلیپ سنگھ کے ساتھ کار میں دو گھنٹے تنہائی میں گزارنے کا موقع ملا، خوب باتیں ہوئیں، بہت ذہین آدمی ہیں، پڑھے لکھے بھی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عالم و فاضل

ہیں۔"

ہم سے پھر خاموش نہ رہا گیا۔ عرض کیا۔ "یوں کہئے کہ عالم و فاضل تھے، کیونکہ آپ کے ساتھ دو گھنٹے تنہائی میں گزارنے کے بعد ان کا سارا علم و فضل زائل ہو گیا ہو گا۔" خان صاحب نے ہمارے جملہ معترضہ پر دھیان نہ دیا اور اپنی بات یوں مکمل کی۔ "میں نے مسقط کی طنز و مزاح کانفرنس کے لئے مضمون بڑی رواداری میں لکھا تھا، مگر بات بن گئی۔ اس مضمون کو سامعین نے بہت پسند کیا۔" یہ کہہ کر خان صاحب نے مضمون کی نقل ہمارے سامنے رکھی اور کہا کہ اسے ضرور پڑھئے۔

خان صاحب کے جانے کے بعد ہم نے ان کا مضمون پڑھ ڈالا، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ گھر پہنچتے ہی فون کریں گے اور پوچھیں گے کہ مضمون پڑھا یا نہیں۔ اس مضمون کا عنوان ہے۔ "کراچی کا ادبی جغرافیہ" جس میں انہوں نے بڑی چابک دستی سے کراچی کے ادبی جغرافیے کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے علاقوں کا جغرافیہ ہی نہیں، تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ یہ خان صاحب کا آخری مضمون ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل مختصر سے اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پورا مضمون کتنا دلچسپ ہو گا۔

"کراچی کے جغرافیے میں پنجاب کے پہاڑوں جیسا حسن ہے نہ وہاں کی خلیجوں جیسی وسعت و گہرائی۔ پنجاب میں جو خلیج حضرت احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے درمیان واقع ہے اور جس کے ایک ایک کنارے کو فرداً فرداً ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید سنبھالے ہوئے ہیں، اس کی مثال تمام عالم ادب میں نہیں ملتی، ہاں اگر سراغ لگایا جائے تو ہمارے پڑوس میں ایک وسیع و عمیق خلیج جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے درمیان مل جائے گی۔ بہر حال ہمارے ہاں کی خلیج کی وسعت و گہرائی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ گزشتہ ربع صدی سے اسے پاٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن ہنوز اس کی گہرائی کا پتا نہیں چلا۔ جب کبھی ایسی کوئی کوشش بار آور ہوتی نظر آتی ہے تو مذکورہ ڈاکٹر صاحبان جو خلیج میں مزید گہرائی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔"

خان صاحب کراچی کی ادبی محفلوں کی جان تھے، کوئی ادبی جلسہ ہو، کسی کتاب کی تقریب رونمائی ہو، کوئی گھریلو نشست ہو، خان صاحب اس میں نہ صرف موجود ہوتے تھے، بلکہ اپنا کلام سنا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کر یا کوئی مضمون پڑھ کر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے تھے۔ اپنے گھر پر بھی وہ دعوتوں کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ باہر سے آنے والے ادیبوں کی دعوتیں وہ ضرور کرتے تھے اور ایسی دعوتیں اتنی "پرجوش" ہوتی تھیں کہ ان پر دعوت ولیمہ کا گمان گزرتا تھا، ابھی پچھلے دنوں لندن کے عاشور کاظمی کراچی آئے تو ان کے اعزاز میں خان صاحب نے جو دعوت کی، اس میں سوا سو کے قریب ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ ایسی دعوتوں میں خان صاحب بہاری کباب خود بناتے تھے۔ یہ کباب مہمانوں کی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک دعوت میں ہم نے خان صاحب سے یہ کہا تھا، جب آپ اتنے عمدہ کباب بنا لیتے ہیں تو پھر شعر کیوں کہتے ہیں۔ اس موقع پر خان صاحب نے جو جوابی حملہ کیا تھا، اس کا جواب آج تک ہمارے پاس نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا، کباب آپ جیسوں کے لئے بناتا ہوں اور شعر سخن فہموں کے لئے کہتا ہوں۔

ان جیسا ادبی خدمت گزار کراچی میں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ادبی رسالوں کی تو وہ بے مثال خدمت کرتے تھے، خود خریدار بنتے تھے اور دوسروں کو خریدار بناتے تھے اور پھر ان کے لئے اشتہار بھی فراہم کرتے تھے۔ بعض ادبی رسالوں کے ایڈیٹر تو ہر وقت ان کے دفتر میں بیٹھے رہتے تھے اور خان صاحب کے وسیع تعلقات اور دستر خوان سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ ہم بہت سے ایسے ادیبوں کو جانتے ہیں جن کی کتابوں کی تقاریب رونمائی پر شائع ہونے والے مجلوں کے لئے خان صاحب اشتہار ہی نہیں، مشہور ادیبوں کی آراء بھی فراہم کرتے تھے۔ کتابوں کی اشاعت میں بھی وہ ہر ممکن مدد کرتے تھے، اس کی تازہ مثال رشید منظر کا مجموعہ کلام "آئینہ پس آئینہ" ہے۔ رشید منظر لندن میں رہتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب کا مسودہ خان صاحب کو بھیج دیا اور خان صاحب نے دن رات ایک کر کے چند روز میں یہ مجموعہ نہایت آب و تاب سے چھپوا دیا۔ اس کام کی صحیح داد وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنہیں معلوم ہے کہ شعری مجموعہ چھپوانا شعر کہنے کی طرح آسان نہیں ہے۔

خدمت کا جذبہ صرف ادب تک محدود نہیں تھا، عام زندگی میں بھی خان صاحب لوگوں کے کام آتے رہتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ خدمت خلق کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ بہت سے بیروزگاروں کو انہوں نے ملازمتیں دلوائیں اور بہت سے مستحقین کی وہ خاموشی سے مدد کرتے رہتے تھے۔

خان صاحب کو اپنی خان صاحبی پر بڑا ناز تھا۔ اگر کسی سے ناراض ہو جاتے تو کہتے "میں

پٹھان ہوں، سمجھ لوں گا۔ لیکن یہ ناراضی وقتی ہوتی، کیونکہ ان کے دل میں کسی بھی منفی جذبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سراپا محبت تھے اور وسیع القلب اتنے کہ اپنی تحریروں پر کڑی سے کڑی تنقید کو بھی تعریف سمجھ کر خوش ہوتے۔ ہم نے اپنے کالموں میں بارہا ان کا ذکر کیا ہے اور ہمیشہ باندازِ دیگر، لیکن کیا مجال کہ خان صاحب کی پیشانی پر کوئی شکن پڑی ہو، ان کی آخری کتاب "اگر نامہ بر ملے" شائع ہوئی تو انہوں نے کالم لکھنے کی فرمائش کی۔ ہم نے کہا، خان صاحب آپ کی یہ کتاب پسند نہیں آئی کیونکہ اس میں بیشتر خطوط غیر ادبی ہیں، جن کی صحیح جگہ ردی کی ٹوکری تھی، مگر آپ نے انہیں کتاب میں شامل کر دیا۔ کہنے لگے آپ یہی باتیں کالم میں لکھ دیجئے۔ ہم نے کہا مگر آپ ناراض ہو جائیں گے۔ فرمایا: آپ لکھ کر تو دیکھئے۔ ہم نے فرمائش کی تعمیل کی اور کچھ اس قسم کی باتیں کالم میں لکھیں۔

"منظر علی خان منظر نے عجیب ذہن رسا پایا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بینکار ہیں لیکن ایک کھاتا دنیائے ادب میں بھی کھول رکھا ہے جس میں وہ کتابیں لکھ لکھ کر جمع کراتے ہیں اور اصل سے کئی گنا زیادہ منافع ادبی شہرت کی صورت میں وصول کرتے رہتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا ہے۔ نثر لکھتے ہیں تو انیسویں صدی کے اودھ پنچ کے اسلوب میں اور شعر کہتے ہیں تو بیسویں صدی کے نوح ناروی کے رنگ میں۔ ان جیسے ادیب کم ہیں جو پوری دو صدیوں پر حاوی ہوں۔"

"منظر علی خان خود ہی نہیں لکھتے بلکہ انہوں نے بے شمار لوگوں کو بھی لکھنے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ خود لکھنا کوئی مشکل کام نہیں کہ اس کے لئے کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن دوسروں سے لکھوانا بہت مشکل کام ہے اور یہ مشکل اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب موضوع ذرا ٹیڑھا ہو۔ منظر صاحب اپنی نصف درجن تصانیف پر ایک سو سے زیادہ لوگوں سے مقدمے، دیباچے، فلیپ کی آراء اور توصیفی خطوط لکھوا چکے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں متعدد ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں منظر صاحب ہی کی وجہ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کاغذ اور قلم کے استعمال کا موقع ملا۔"

"زیر نظر کتاب میں منظر صاحب کے متعدد خط شامل ہیں، ان میں جو دلچسپی ملتی ہے وہ حاصل کتاب ہے۔ ان خطوط سے ایک باغ و بہار شخصیت سامنے آتی ہے۔ وہ انشاء کی سابقہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

تعارف کے پہلے ہی خط میں اپنے مکتوب الیہ سے اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں، جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ موقع و محل کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں، ان کا مزاح مہذب اور شائستہ ہوتا ہے اور طنز ایسا لطیف جس کو ہدف بنایا جائے وہ بھی محظوظ ہوتا ہے کہ وار خالی گیا۔"

یہ کالم پڑھ کر خان صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ یہ کالم نوح ناروی وغیرہ کے خلاف ہو تو ہو، میرے خلاف بالکل نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ خان صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔ یقین نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ ان جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

تماشائی یا جز و تماشا

پاکستان میں دو طرح کے ادیب پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جو لکھتے کم ہیں اور شور زیادہ مچاتے ہیں۔ ان کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں، رسالوں کے خصوصی گوشے نکالے جاتے ہیں۔ اخباروں کے ادبی صفحات پر ان کی حرکات و سکنات کے بارے میں خبریں چھپتی ہیں (حرکات کے بارے میں کچھ زیادہ ہی) باتصویر انٹرویو شائع ہوتے ہیں جن میں پسندیدہ سبزیوں اور پھلوں کے نام تک پوچھے جاتے ہیں اور اگر کوئی بات نہیں پوچھی جاتی تو یہ کہ ہمارے ملک میں لوگ وہ کام کیوں کرتے ہیں جس سے انہیں ذہنی مناسبت نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کو چمڑا رنگنے کا کام کرنا چاہیے، وہ ادیب کیوں بن جاتے ہیں۔ معاف کیجئے گا، ہم یہ بات رواروی میں لکھ گئے ورنہ چمڑا رنگنے کا کام، ادب تخلیق کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

اس گروہ کے ادیبوں کے نام کیا گنوائیں کہ دو چار کے نام لے بھی لئے تو دو چار سو کو شکایت ہوگی کہ انہیں نظر انداز کر دیا۔ ناموں کے سلسلے میں یہ لوگ بہت حساس ہیں اور ہر جگہ اپنے نام کی تلاش میں اس طرح رہتے ہیں جیسے یہ ان کی کوئی گم شدہ دولت ہو۔ سالانہ ادبی جائزوں سے لے کر ادبی جلسوں کی روداد وں تک میں انہیں اپنا نام دکھائی نہ دے تو اسے ادبی کردار کشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وفات پا جانے والے ہم عصروں کی تجہیز و تکفین ..... میں بھی اس لئے شرکت کرتے ہیں کہ اخبارات میں اس حوالے سے جو خبریں چھپتی ہیں، ان میں شرکائے تجہیز و تکفین کے نام شامل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک "ادیب" کا یہ واقعہ خاصا مشہور ہے کہ ایک اخبار کے ادبی صفحے کے انچارج کی حیثیت سے اس نے اپنے نائب کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جب بھی کوئی ایسی خبر یا مضمون چھپنے کے لئے آئے، جس میں ناموں کی فہرست ہو تو بلا تکلف اس فہرست

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

میں انچارج کا نام شامل کر دیا جائے۔ ایک مرتبہ سال گزشتہ کے مرحومین کی فہرست چھپنے کے لئے آئی، حسب معمول اس میں انچارج کا نام بھی شامل کر دیا گیا۔ اس فہرست میں اپنا نام دیکھ کر انچارج بہت خوش ہوا۔ خوشی کی وجہ یہ تھی کہ اگلے ہفتے جب اس غلطی کی تصحیح شائع ہوگی تو اس میں بھی موصوف کا نام شامل ہوگا۔

ادیبوں کے دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور نام و نمود کے گرد و غبار سے اپنا چہرہ مسخ نہیں کرتے۔ ادب کو غیر ادبی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بناتے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ادیب کہلوانے پر بھی اصرار نہیں کرتے۔ دنیا اور دنیاداری کے ہنگاموں سے الگ رہ کر خاموشی سے لکھتے ہیں اور اس سے زیادہ خاموشی سے چھپوا دیتے ہیں۔ انہیں ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلے کی پروا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے کام میں جان ہوگی تو وہ آپ ہی اپنی ستائش اور آپ ہی اپنا صلہ بن جائے گا۔ ایسے ادیب ہمارے ملک میں بہت کم ہیں اور انہیں میں سے ایک ہمارے آج کے کالم کا موضوع ہے۔

مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' کو اگر اردو کی تاریخ ساز کتابوں میں شمار کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں جب پہلی مرتبہ چھپی تھی تو اس سے اٹھائیس برس پہلے چھپنے والی مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبار خاطر'' کے بعد یہی ایک کتاب ایسی ہے جسے بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی۔ دونوں کتابوں میں فرق یہ ہے کہ ''غبار خاطر'' اپنے مصنف کی آخری اور ''آواز دوست'' پہلی کتاب ہے۔ ایک کے پیچھے، ایک عہد آفریں شخصیت کی عمر بھر کی ریاضت تھی تو دوسری کے پیچھے، ایک آفریدۂ عہد جواں عمر کا صاف ستھرا ادبی ذوق، مطالعہ اور مشاہدہ۔ ''آواز دوست'' اپنے موضوع اور اسلوب دونوں کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ موضوع نیا تھا (مینار، کچھ سنگ و خشت کے اور کچھ گوشت پوست کے) اور اسلوب میں بھی قدرے تازگی تھی جو محمد حسین اور ابوالکلام جیسے آزادوں کی مرہون منت تھی۔ مرصع کاری اور ملمع سازی خود مختار مسعود کی تھی۔ اس اسلوب میں ظاہری چمک دمک تو تھی لیکن وہ روشنی نہ تھی جو اندر سے پھوٹتی ہے۔ اس کے باوجود یہ نثر اس لئے مقبول ہوئی کہ ایسی نثر لکھنے والا ابھی کوئی دور دور تک نظر نہ آتا تھا۔

مختار مسعود کی دوسری کتاب ''سفر نصیب'' پہلی کتاب کی مقبولیت کا سبب بنی۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ اس میں سے خلیل جبران کے رنگ کے

ایسے پچیس تیس جملے نکالے جا سکتے ہیں جو علامہ اقبال کے اشعار کی طرح کتبوں کی صورت میں لکھوا کر دیواروں پر آویزاں کئے جا سکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دینا مختار مسعود کا خاص فن ہے۔ جہاں تک انداز تحریر کا تعلق ہے، اس کتاب میں پہلی کتاب کے مقابلے میں رعایت لفظی اور ہم قافیہ و ہم صوت الفاظ کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کتاب مصنف کی ماندگی کے وقفے کی یادگار ہے۔ شاید یہ ماندگی کا وقفہ ضروری بھی تھا کیونکہ آگے چلنے کے لئے دم لینے کی ضرورت تھی۔ آگے چلنے کا نتیجہ ''لوح ایام'' کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع انقلاب ایران ہے۔ ۱۹۷۸ء کی گرمیوں میں مختار مسعود ایران، پاکستان اور ترکی کی علاقائی ترقی کے ادارے (آر سی ڈی) کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اس ادارے کا صدر دفتر تہران میں تھا۔ یہاں کے قیام کے دوران مختار مسعود نے ایران کی تاریخ کو ایک نئے دور میں داخل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ کس طرح شہنشاہ ایران کی بے مثال عسکری قوت عوامی غیظ و غضب کے سیل بے پناہ کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بے حیثیت ٹھہری۔ مختار مسعود مؤرخ نہیں ہیں کہ مؤرخ کا بے حس قلم حالات و واقعات کو اعداد و شمار کی طرح درج کتاب کرتا اور میزانیں مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے اپنے مشاہدات و تجربات کو سپرد قلم کیا ہے اور اس میں یہ اہتمام ملحوظ رکھا ہے کہ گرد و پیش میں جو کچھ رونما ہو رہا ہے اسے سفارت کاری کے فاصلے سے نہ دیکھا جائے بلکہ اپنی منصبی حدود و قیود کو توڑ کر گلیوں اور بازاروں میں چل پھر کر اس تاریخ کو بچشم خود دیکھا جائے جو انقلاب کے نقش گروں کے چہروں سے ظاہر ہونے والے عزم اور جسموں سے بہنے والے خون سے لکھی جا رہی تھی۔ ایرانی انقلاب سے اس قدر ذاتی وابستگی کی وجہ سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ مختار مسعود کے لاشعور میں کہیں یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ ایسا انقلاب تو خود ان کے ملک میں بھی آنا چاہئے جو ظلم اور ظالم کا نشان مٹا کر رکھ دے۔ انہیں یہ خیال بھی آتا تھا کہ پاکستان میں یہ سب کچھ کیوں نہیں ہوا اور کیوں نہیں ہو رہا۔ یہ چھپی ہوئی خواہش کتاب کے آخری حصے کی ان سطور میں بے نقاب ہو جاتی ہے جن میں مختار مسعود ایک شعلہ بیان خطیب کے انداز میں اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اے پاکستانیو! تمہاری غیرت، جرأت اور دور اندیشی کو کیا ہو گیا ہے۔ فرشتوں کا انتظار کر رہے ہو؟ جب تک تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو، وہ نہیں آئیں گے۔ اٹھو، قربانی دو۔ وہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

شہیدوں کے لہو کی خوشبو سونگھ کر آ جائیں گے۔"

پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں انقلاب سے پہلے کے، انقلاب کی آمد آمد کے اور انقلاب کے فوراً بعد کے ایران کے بارے میں جتنا اور جیسا مواد ملتا ہے، اردو کی حد تک اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ لیکن اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں، ایک ادبی تخلیق ہے جس کا ماخذ لکھنے والے کی بصارت بھی ہے اور بصیرت بھی۔ یہ کسی صحافی کی یادداشتوں کی کھتونی بھی نہیں کہ صحافی خبریں جمع کر دیتے ہیں۔ یہ کتاب خبر و نظروں دونوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔

اس کتاب کو اس کے اسلوب نے ادبی تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ پہلے مختار مسعود اپنی عبارت کو مؤثر بنانے کے لئے لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی تراش خراش پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ معانی لفظوں کے تابع ہو جاتے تھے اور بعض اوقات رعایت لفظی کے اہتمام سے تابع مہمل بھی۔ مگر اس کتاب میں لفظ و معنی کی ہم آہنگی دیدنی ہے۔ معانی اپنے حسب حال الفاظ اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اس میں مصنف کو کسی کاوش اور کسی کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ پہلے وہ جو برساتی ندی کا پرشور تیز بہاؤ تھا، اب جوئے آہستہ خرام کی نغمگی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں مختار مسعود نے بالآخر اپنے اس اسلوب کی دریافت کر لیا ہے جس کی بنا پر ان کا شمار اردو کے صاحب طرز لکھنے والوں میں ہوگا۔ اب وہ محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی قید سے آزاد ہو کر اپنی الگ راہ پر گامزن ہو چکے ہیں۔

یہ کتاب یوں تو انقلاب ایران کے بارے میں ہے لیکن اس میں مصنف کی "غیر انقلابی" یادوں کی بھی ایک زیریں لہر ملتی ہے جس سے نہ صرف کتاب کی افادیت میں بلکہ دلچسپی میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ایران کے بارے میں کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے جونہی مصنف کو کوئی ایسا واقعہ یاد آ جاتا ہے جس کا ایران سے یا کتاب کے اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں لیکن زیر تحریر واقعے سے مماثلت کی بنا پر اس لائق ہے کہ اسے بھی قارئین تک پہنچا دیا جائے تو اس میں مصنف کسی قسم کا تکلف روا نہیں رکھتا اور غیر متعلق واقعہ بھی بیان کر دیتا ہے۔ اس بات کو ہم ایک دو مثالوں سے واضح کریں گے۔

ایک مرتبہ وزیر اعظم بازرگان نے مسلمان سفیروں کو افطار پر مدعو کیا۔ دعوت نامہ مختار مسعود

کو بھی ملا۔ انہوں نے شرکت کی۔ یہاں انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ دعوت شیراز کسے کہتے ہیں۔ دو طرح کے چاول، ایک سالن اور وہ بھی بینگن کا، دعوت کی یہ سادگی دیکھ کر مختار مسعود کو اپنے ملک کے ایک وزیر اعظم کی شکم پروری کا اہتمام یاد آ گیا۔ اس وزیر اعظم کی باورچی اعظم سے کسی زمانے میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے وزیر اعظم کے باورچی خانے کی جو تفصیلات فراہم کیں، وہ یہ تھیں: "(وزیر اعظم ہاؤس کے کچن میں) چار ہیڈ کک ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ ہم سب کی اپنی اپنی تخصیص ہے۔ میں مغلئی کھانوں کا ماہر ہوں۔ ہمارے ساتھ کچن میں بتیس افراد کا عملہ ہے۔ اس کے علاوہ چار ڈاکٹر ہیں۔ چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ نہ جانے صاحب رات کے کون سے پہر کھانے کے کچھ مانگ لیں۔ ڈاکٹر پہلے چکھتا ہے، پھر کھانا صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ صاحب جن برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں، انہیں اچھی طرح دھونے اور جراثیم سے پاک کرنے کے بعد سیلوفین کے مہر بند لفافوں میں رکھا جاتا ہے۔ ایک آدمی اس کام پر مامور ہے کہ وہ صاحب پر کھانا کھاتے ہوئے نظر رکھے اور یہ بتائے کہ انہیں کون سا کھانا مرغوب یا نامرغوب ہے۔ جو ڈش صاحب دوسری بار منگا لیں اس کا اندراج ریکارڈ میں ہو جاتا ہے۔"

باورچی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مختار مسعود لکھتے ہیں: "یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریکارڈ کے مطابق ہمارے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو وطن واپس آئے ہوئے چار چھ ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔"

شہنشاہ ایران نے ۱۹۷۱ء میں ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا جشن منایا تھا۔ اس موقع پر دنیا کے کئی سربراہوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ کروڑوں ڈالر خرچ کر کے ان سربراہوں کے قیام کے لئے جو خیمہ بستی بسائی گئی تھی، وہ جشن کے تین دنوں میں تو کام آئی اور پھر سیاحوں کی تفریح گاہ بن گئی۔ مختار مسعود اس خیمہ بستی کو دیکھنے گئے۔ وہاں انہیں اس بستی کے ایک مہمان کا واقعہ یاد آ گیا۔ لکھتے ہیں: "مہمانوں میں شامل ایک صدر کا نام یحییٰ خان تھا اور شہزادی کا نام گریس تھا۔ استقبالیہ میں یہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہزادی صاحبہ کا شاہی لباس اوپر سے کھلا تھا۔ شانہ نظر آتا تھا۔ صدر یحییٰ نے کاندھے پر ہاتھ پھیر کر یہ دیکھنا چاہا کہ ہالی وڈ کی سابق فلم اسٹار گریس کیلی کی جلد واقعی اتنی شفاف اور ملائم ہے جتنی نظر آتی ہے یا نشے کی وجہ سے ان کی آنکھیں دھوکا کھا رہی

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہیں۔ بھلے وقتوں میں آغا خان نسوانی جلد کی پرکھ کے نامور ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بڑی ہو گئی، عہدہ بہت بڑا ہو گیا۔ بری عادت نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا، انہوں نے ہم نشین کے جسم کو چھو لیا۔ یہ تجسس ماہرانہ بے اختیاری کا نتیجہ تھا مگر گریس صاحبہ کو ہمارے صدر کی یہ معصوم اور بے ضرر حرکت ناگوار گزری ..... اس نے غصہ بھری نگاہ ڈالی۔ پہلو بدلا اور ہم نشین کی طرف پشت کر لی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اسے طول دیتے ہوئے اپنی شال منگوائی اور کاندھوں پر ڈال لی۔"

اس قسم کے واقعات پڑھ کر خیال آتا ہے مختار مسعود ایران کے انقلاب کی تاریخ لکھ چکے۔ اب انہیں اپنے ملک کے جمود اور بے حسی پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ وہ پاکستان کی تاریخ کے بھی عینی شاہد ہیں۔ تماشائی ہی نہیں، سول سروس کا رکن ہونے کی وجہ سے جزو تماشا بھی رہے ہیں۔ پچھلے پچاس برسوں میں انہوں نے پاکستان کے زوال کی تاریخ بنتے دیکھی ہے اور کسی حد تک اس کے بنانے میں بھی حصہ لیا ہے۔ اب انہیں چاہئے کہ اس تاریخ کو بھی قلم بند کر دیں۔ یہ کام وہی کر سکتے ہیں کہ وہ بہت سے "درون خانہ" رازوں کے محرم ہیں۔ اگر انہوں نے یہ کام نہ کیا تو پھر ممکن ہے آنے والی نسلیں انہیں تاریخ سے نظر چرانے والوں میں شمار کریں۔

طوافِ کوئے ملامت

ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ شاعری کا ریاضی سے کوئی تعلق ہے یا نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ دو ریاضی دانوں نے شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ ایک تو خواجہ دل محمد تھے جنہوں نے ریاضی پر متعدد کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی نظمیں لکھیں، دوہے لکھے اور بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ دوسرے انجم رومانی ہیں جو ساری زندگی کالج کے لڑکوں کو ریاضی پڑھاتے رہے لیکن خود مکتبِ غمِ دل میں سبق لیتے رہے یعنی غزلیں کہتے رہے۔ خواجہ دل محمد کی شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے جیسے ریاضی کی بیوست نے شاعری کا گھر دیکھ لیا ہو لیکن انجم رومانی نے اپنی شاعری پر ریاضی کا سایہ نہیں پڑنے دیا، زلفِ یار ہی کے سائے کو کافی سمجھا۔ ان کا مجموعہ کلام ہم نے دیکھا ہے۔ اس میں کہیں بھی انہوں نے ریاضی دان کی حیثیت سے دو جمع دو کا حاصل چار نہیں بتایا۔ کہیں گھٹا کر تین کر دیا اور کہیں بڑھا کر پانچ۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس شعر میں رات کو گھٹایا یا بڑھایا گیا ہے:

وہی رات ان کی وہی رات میری
کہیں گھٹ گئی ہے کہیں بڑھ گئی ہے

ہمیں انجم رومانی کی صحیح عمر معلوم نہیں ہے لیکن ان کی قادر الکلامی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشقِ سخن ساٹھ پینسٹھ برس سے کم کیا ہوگی۔ اسی سے عمر کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تذکرہ نگاری کی اصطلاح میں ان کا شمار "قدماء" میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے جیسے ن م راشد شاعروں کے شاعر تھے، انجم رومانی بزرگوں کے بزرگ ہیں۔ لیکن وہ ایسے بزرگ نہیں ہیں جو زندہ دلی کی نعمت سے محروم ہوں۔ زندہ دلی کا اظہار ان کی شاعری سے بھی ہوتا ہے اور گفتگو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

سے بھی۔ ان کا واحد مجموعہ کلام "کوئے ملامت" ہماری پسندیدہ کتابوں میں سے ہے۔ جب کبھی ان کی شاعرانہ زندہ دلی سے محظوظ ہونے کو جی چاہتا ہے، ہم اس مجموعے کی ورق گردانی کر لیتے ہیں۔ گفتگو میں پائی جانے والی زندہ دلی سے استفادہ کے لئے ہم موصوف کے انٹرویو پڑھ لیتے ہیں جو سال میں دو تین مرتبہ اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کا ایک تازہ ترین انٹرویو ہمارے سامنے ہے جو گزشتہ ہفتے "نوائے وقت" میں شائع ہوا ہے اور اسی سے استفادے کے لئے یہ کالم لکھا جا رہا ہے۔

انجم صاحب نے اس انٹرویو میں جو مزے مزے کی باتیں کی ہیں، ان میں سیاست سے لے کر ادب تک، بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اپنے معاصرین، خصوصاً کم عمر معاصرین کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے خاصی بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ مثلاً احمد فراز کے بارے میں فرماتے ہیں: "وہ صرف نوجوانوں کا شاعر ہے اور اس کی سیاسی شاعری مجھے ناپسند ہے۔" عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے بزرگ، نوجوانوں کے کردار سے مطمئن نہیں ہیں اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ انجم صاحب بھی نوجوانوں کے ساتھ عام بزرگوں جیسی روش اختیار کرتے ہوئے جو الزام لگایا ہے، وہ کسی زمانے میں تو درست تھا مگر اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ ہمارے نوجوان باشعور ہو چکے ہیں۔ عشق و عاشقی کے وہ طریقے جن کا ذکر فراز کی شاعری میں ہے، اذکارِ رفتہ ہو چکے ہیں۔ نوجوانوں کو لئے ان میں کوئی کشش نہیں رہی۔ وہ فراز کے بتائے ہوئے طریقوں سے زیادہ ترقی یافتہ طریقوں سے واقف ہیں۔ ایسی صورت میں فراز کو نوجوانوں کا شاعر کہنا حقیقت سے بعید ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اب احمد فراز اپنی ہی عمر کے لوگوں کا پسندیدہ شاعر ہے۔ جن کی عمریں پینسٹھ سے ستر سال کے درمیان ہیں، وہ فراز کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ فراز اب آرزوؤں کا نہیں، حسرتوں کا شاعر ہے کیونکہ اسی عمر میں آرزوئیں حسرتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا چاہتا ہے۔

رہی فراز کی سیاسی شاعری کو پسند نہ کرنے کی بات تو انجم صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا کا کاروبار ان کی پسند یا ناپسند پر موقوف نہیں۔ غیر سیاسی شاعری سے دنیاوی فوائد حاصل ہو سکتے تو آج انجم صاحب خود بھی کشور ناہید اور احمد فراز کی طرح کسی قومی ادارے کے سربراہ ہوتے اور انہیں یہ شکایت نہ ہوتی:

"مجھے حکومت نے کسی ایوارڈ کے ذریعے احسان مند نہیں کیا اور اب جب کہ غیر مستحق لوگوں کو حسنِ کارکردگی کے تمغے مل چکے ہیں، حکومت مجھے ایوارڈ دے گی تو میں انکار کر دوں گا۔ پاکستان میں جو سلوک جینوئن اور سچے تخلیق کاروں کے ساتھ ہو رہا ہے، وہی اربابِ اقتدار نے پورے پاکستان کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے۔"

انجم صاحب نے بھی کیا سادہ طبیعت پائی ہے۔ حکومت بھلا انہیں ایوارڈ کیوں دینے لگی۔ ایوارڈ تو انہیں کو ملتا ہے جن کا غیر مستحق ہونا ثابت ہو جائے۔

ظفر اقبال کا ذکر کرتے ہوئے انجم صاحب فرماتے ہیں: "اس نے اپنے آپ کو ضائع کر لیا ہے۔" ہمیں اس رائے سے صدفی صد اتفاق ہے کیونکہ یہ رائے ظفر اقبال کے حق میں جاتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعراء اپنی حرکات سے نیز شاعری سے دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ظفر اقبال نے اس روشِ عام سے اجتناب کیا اور شاعری کے ذریعے نازل ہونے والا عذاب اپنی جان پر لے لیا۔ وہ چاہتے تو دوسرے شاعروں کی طرح اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی ضائع کر سکتے تھے۔ رہا اس کا کاغذ ہونا جس پر ظفر اقبال کی کتابیں چھپی ہیں تو یہ کوئی ایسا نقصان نہیں ہے جسے اہمیت دی جائے۔ کاغذ کی تو قسمت ہی میں ضائع ہونا لکھا ہے۔ اگر ظفر اقبال ضائع نہ کرتے تو ان کے حصے کا کاغذ بھی انیس ناگی ضائع کر دیتے۔ ظفر اقبال کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی کتابیں شائع کر کے انیس ناگی کو مزید کاغذ ضائع کرنے سے باز رکھا۔

افتخار عارف پر انجم صاحب قدرے مہربان نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "سنا ہے کہ وہ اچھا شاعر ہے۔" گزارش ہے کہ سنی سنائی باتوں پر نہ جائیں، خود مطالعہ کر کے فیصلہ کریں کہ افتخار عارف نے ظفر اقبال کی طرح خود کو ضائع کیا ہے یا احمد فراز کی طرح دوسروں کو۔ ویسے اچھا ہی ہے کہ انجم صاحب نے افتخار عارف کو نہیں پڑھا، ورنہ جس طرح انہوں نے ناصر کاظمی پر الزام لگایا ہے کہ اس نے میر اور فراق کو لہجے چوری کر لئے تھے، اسی طرح افتخار عارف کے بارے میں بھی وہ کہتے کہ اس نے انیس، آتش اور یگانہ کے ہاں نقب لگائی ہے۔

انجم صاحب کا خیال ہے کہ ناصر کاظمی زندہ رہتا تو بڑا شاعر بنتا۔ فیض کے بڑا شاعر نہ بننے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کے پاس اپنا لہجہ بہت تھوڑا ہے۔ ان دونوں آراء پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناصر کاظمی اس لئے بڑا شاعر نہیں کہ وہ بعد از وقت بھی زندہ رہا۔ گویا زندگی اور موت تو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن کسی کا بڑا شاعر بننا انجم صاحب کی صوابدید پر موقوف ہے۔ انجم صاحب نے مزید ستم یہ ڈھایا ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیس ڈالا اور قتیل شفائی جیسے بانکے اور سجیلے شاعر کو اوسط درجے کے شاعروں میں شمار کیا ہے۔ اس سے پہلے منیر نیازی بھی قتیل شفائی کی ادبی حیثیت سے انکار کر کے انہیں محض فلمی شاعر ہونے کا طعنہ دے چکے ہیں۔ قتیل ساتھ معاصرین کی اس کھلواڑ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ شاعر اب سطح پر پہلے سے زیادہ فعال ہو گئے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں انہوں نے تازہ غزلوں اور گیتوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ادبی معیار کی بات کرنے والے جب اس بوجھ تلے آئیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ معیار ہی سب کچھ نہیں ہوتا، انبار کا بھی اپنا ایک وزن اور وقار ہوتا ہے۔

انجم صاحب کو ترقی پسندوں سے خدا واسطے کا بیر معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں: "یہ لوگ شراب پی کر مزدوروں کے حق میں نعرے لگاتے تھے۔" معلوم نہیں اعتراض شراب پینے پر ہے یا مزدوروں کے حق میں نعرے لگانے پر۔ اگر دونوں پر ہے تو انصاف کی بات یہ ہے کہ شراب پی کر غل غپاڑہ کرنے سے نقضِ امن کا اندیشہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ مزدوروں کے حق میں نعرے لگانے سے سرور کی کیفیت کو دوام حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی نعرے لگانے سے سرور کی کیفیت کو دوام حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی نعرے ادبی تخلیقات کا نعم البدل قرار پاتے ہیں۔

انجم صاحب نے موجودہ ادبی صورت حال کی ان الفاظ میں دردناک تصویر کشی کی ہے: "ادب میں ایک گروپ نے تمام مفادات اپنے دامن میں سمیٹ رکھے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں سے لے کر سرکاری ادبی اداروں تک ادیبوں کی فہرستیں یہی گروپ فراہم کرتا ہے۔ پہلے آرٹس کونسل والے مشاعروں میں مجھے بطور شاعر بلاتے تھے مگر گزشتہ پانچ سات سال سے بطور سامع بلانے لگ گئے ہیں۔ اب کسی شاعر کو محض شاعر کی حیثیت سے مدعو نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا وہ ایوانِ اقتدار تک رسائی رکھتا ہے؟ کیا وہ کالم نگار ہے اور کیا اسے نہ بلانے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟ یہ قبضہ گروپ جس کے تمام ارکان اپنے اپنے مفادات کے لئے اکٹھے ہیں، ہر دور میں، خواہ وہ مارشل لاء کا دور ہو یا جمہوری دور، حکمرانوں کے آس پاس رہتے ہیں۔ مارشل لاء میں نعتیں لکھتے ہیں اور مارشل لاء کے بعد اپنی مجبوریوں کا رونا روتے ہیں۔"

یہ صورت حال انتہائی افسوس ناک ہے۔ دنیائے ادب میں اتنی تاریکی پہلے کبھی نہ تھی۔ بہر حال اس تاریکی میں روشنی کی بھی ایک کرن نظر آتی ہے کہ انجم صاحب کو مشاعروں میں بہ حیثیت شاعر نہ سہی، بطور سامع ضرور بلایا جاتا ہے۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی مشقِ سخن رکھنے والے شاعر کے ساتھ یہ سلوک حسنِ مروت کا آئینہ دار ہے۔ آرٹس کونسل والے اگر اتنی بھی مروت سے کام نہ لیتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

انجم صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے: "ہمارے ہاں ادبی ادارے ادب کے فروغ کے لئے نہیں، بعض لوگوں کو نوازنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اکادمی ادبیات ہی کو دیکھ لیجئے، ادب یا ادیبوں کو اس سے کیا فائدہ ہوا؟ اکادمی کے فنڈز یا تو اس کے سربراہ اور ان کے اقرباء کی سہولتوں پر خرچ ہو جاتے ہیں یا پھر سرکاری کانفرنسوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔"

ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ ادب کو ادیبوں ہی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تو اکادمی ادبیات کی شکایت کیوں کی جائے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ ادارے بعض لوگوں کو نوازنے کے لئے بنائے جاتے ہیں تو پھر اکادمی کے سربراہ اور ان کے اقرباء کو حاصل ہونے والی سہولتوں پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ ہاں! اس وقت آپ کو اعتراض کا حق ہوتا جب اکادمی آپ کے لئے بنائی جاتی اور فائدہ دوسرے اٹھاتے۔ خوشی کی بات ہے کہ اکادمی جن لوگوں کے لئے بنائی گئی تھی، ان کا کام آ رہی ہے۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھا چاہئے کہ کسی کی گرہ سے کچھ جا نہیں رہا، آ ہی رہا ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کشکولِ گدائی

ایک روز استاد لاغر مراد آبادی سے ادبی رسالوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ کہنے لگے، رسالے تو قیام پاکستان سے پہلے شائع ہوتے تھے۔ عالمگیر، نیرنگِ خیال، ساقی، زمانہ، الناظر، ہمایوں، ادیب، ایک سے ایک عمدہ رسالہ تھا۔ ان کے ایڈیٹر محنت کرتے تھے، اول تو وہ خود پڑھے لکھے ہوتے تھے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو پڑھے لکھوں کی مدد حاصل کر کے اپنے رسالوں کو بہتر سے بہتر بناتے تھے۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتے تھے۔ عالمگیر اور نیرنگِ خیال کے سالانہ خریدار پانچ پانچ ہزار سے زائد تھے۔ آج یہ حالت ہے کہ کوئی ادبی رسالہ چار یا پانچ سو سے زیادہ چھپے تو اسے قربِ قیامت کی نشانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، پرانے رسالوں کے ایڈیٹر غیر معیاری تحریریں شائع نہیں کرتے تھے، اسی لئے وہ ہر لکھنے والے کو معاوضہ دیتے تھے۔ آج کل کے رسالے لکھنے والوں کو بھی خریداروں کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ ہر شمارے میں چالیس پچاس غزلیں ضرور ہوتی ہیں کہ اس طرح اتنے ہی رسالے بک جاتے ہیں۔ اس معاملے کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ بیشتر ایڈیٹر اپنے آپ کو قاری کی سطح پر دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ جن تحریروں کو شائع کرتے ہیں، انہیں چھپنے سے پہلے پڑھتے ہیں، نہ بعد میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ رسالے کشکولِ گدائی بن جاتے ہیں۔ کسی نے کشکول میں کیک کا ٹکڑا ڈال دیا اور کسی نے باسی روٹی کا ٹکڑا۔ یہی کشکول قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب آگے قارئین کی قسمت کہ ٹکڑے تو انہیں کو توڑنے ہوں گے۔

استادِ گرامی کے ان ارشادات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان

دونوں ملکوں میں، پہلے کی طرح آج بھی، بہت سے عمدہ ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں اور بعض رسالے تو ایسے ہیں جو قیام پاکستان سے پہلے کے رسالوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استادِ محترم نے موجودہ دور کے اچھے رسالوں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اگر وہ صرف بنگلور کے ''سوغات'' ہی کو دیکھ لیتے تو اپنی رائے میں کچھ ترمیم کر لیتے۔ ''سوغات'' موجودہ دور کے بہترین ادبی رسالوں میں سے ہے۔ اس کا ہر شمارہ ایک ایسی ادبی دستاویز ہوتا ہے جس کے مطالعے کے بغیر جدید اردو ادب میں کارفرما رجحانات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اردو کے تقریباً سبھی اچھے لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر محمود ایاز ہیں جو کسی زمانے میں شاعری کیا کرتے تھے۔ جتنی محبت وہ اپنے رسالے پر کرتے ہیں، اگر اس سے آدھی محنت انہوں نے اپنی شاعری پر کی ہوتی تو آج ان کا شمار صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا مگر انہوں نے اپنی شاعری کو رسالے پر قربان کر دیا، حالانکہ ہماری روایت یہ رہی ہے کہ اگر کوئی ایڈیٹر، شاعر ہو تو وہ اپنی شاعری اپنے رسالے میں اس کثرت سے شائع کرتا ہے کہ رسالہ شاعری پر قربان ہو جاتا ہے۔ محمود ایاز ''سوغات'' کو نہ صرف اپنی شاعری سے بلکہ اس شاعری سے بھی پاک صاف رکھتے ہیں جو برصغیر میں روزانہ منوں اور ٹنوں کے حساب سے پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں شاعری نہیں چھپتی۔ چھپتی ہے مگر منتخب شاعری۔

رسالے کے لئے محمود ایاز جو کھکھیڑ اٹھاتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مضامین کی کمپوزنگ حیدرآباد دکن میں، طباعت دہلی میں اور اشاعت بنگلور سے ہوتی ہے۔ اردو کے عام رسالے تو اشاعت کے بعد بھی اتنے شہروں میں نہیں جاتے جتنے شہروں میں سوغات اشاعت سے پہلے گھوم پھر لیتا ہے۔

''سوغات'' کا تازہ شمارہ اسی ہفتے موصول ہوا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اس کے تمام مندرجات کی تفصیل پیش کی جائے، خاص خاص تحریروں ہی کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن میں سرفہرست اختر الایمان کی آپ بیتی ہے۔ اختر الایمان ہمارے دور کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ وہ شاید اردو کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے کبھی غزل نہیں لکھی، بلکہ اس اعتبار سے بھی وہ منفرد ہیں کہ انہوں نے غزل کی لفظیات سے اس حد تک اجتناب کیا ہے کہ ان کی نظموں میں شاید ہی کوئی ایسا مصرع مل سکے جس پر غزل کی سایہ دکھائی دے یا کوئی ایسی شعری ترکیب نظر آ جائے جو

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

غزل کی زبان سے مناسبت رکھتی ہو۔ اسی بنا پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شعری آہنگ نثر سے زیادہ قریب ہے۔ ویسے نثر سے ان کا زندگی بھر تعلق رہا، ابتدائی زندگی میں افسانے لکھے اور فلم سے وابستگی کے دوران مکالمے لکھے، لیکن زندہ رہنے والی نثر انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں لکھی جو ان کی خودنوشت کی صورت میں "سوغات" کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ محمود ایاز کو اس کی جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے کہ انہوں نے اصرار کر کے یہ خودنوشت لکھوائی جو ایک منظم و مرتب آپ بیتی نہ ہونے کے باوجود اردو کی دلچسپ ترین تحریروں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

اختر الایمان ان خودنوشت نگاروں میں سے نہیں ہیں جن کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا مگر پھر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اختر الایمان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا مگر خرابی صحت اور بالآخر موت نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے اپنی سرگزشت لکھتے۔ یہ خودنوشت پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جلدی جلدی میں کسی زمانی ترتیب کے بغیر، نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اسی اختصار، بے ترتیبی اور "لکھنے" سے زیادہ "سنانے" کے انداز نے اس آپ بیتی کو ایک ایسا ادب پارہ بنا دیا ہے جو پڑھنے والے کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔

"سوغات" کے زیر نظر شمارے میں اس آپ بیتی کی جو آخری قسط شائع ہوئی ہے، وہ پچھلی تمام قسطوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اختر الایمان کی زندگی کے کسی ایک دور سے متعلق نہیں ہے۔ اس میں وہ بہت سے ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن کی صحیح جگہ سابقہ قسطوں میں تھی۔ اس قسط میں بعض ایسے افراد کا تذکرہ بھی ہے جو اپنی عجیب و غریب خصوصیات کی بنا پر اس لائق تھے کہ ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جاتا تو بہترین شخصی خاکے وجود میں آ سکتے تھے۔ لیکن اختر الایمان کے پاس تفصیل سے لکھنے کا وقت کہاں تھا؟

"قند مکرر" کے تحت ہمارے دو کالم بھی "سوغات" میں شامل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کالم تو وہ ہے جو محمد خالد اختر کی کتاب "مکاتیب خضر" کے بارے میں تھا اور دوسرا وہ جو سرفراز اقبال کی کتاب "دامن یوسف" (عرف "دامن تا تار") پر لکھا گیا تھا۔ "سوغات" میں یہ دونوں کالم دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ کبھی کبھی ہمارے قلم سے ایسی تحریریں بھی نکل جاتی ہیں جو ہمارے علاوہ دوسروں کو بھی پسند آتی ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو یہی ہوا ہے کہ لکھنے میں ہم خود ضائع ہو گئے یا

اپنے موضوع کو ضائع کر دیا۔ اپنے ضائع ہونے کا تو ملال نہیں ہوتا کہ اب ضائع ہونے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں، لیکن موضوع کے ضائع ہونے پر افسوس اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ زحمت اٹھائی، یہ کام تو ہماری کوشش کے بغیر بھی انجام پا سکتا تھا۔ بعض موضوعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تعمیر میں خرابی مضمر ہوتی ہے۔

مدیر "سوغات" سے ہمیں ایک دوستانہ شکایت ہے کہ انہوں نے ہمارے کالم کسی اور کے نام سے شائع کئے ہیں۔ اگر موصوف کو ہمارا نام پسند نہیں ہے تو وہ ہمیں اجازت دیں، ہم آئندہ انہیں کے نام سے کالم لکھا کریں۔ لیکن ہمیں یہ منظور نہیں کہ ہماری تحریریں کسی مجہول الاحوال سخن ناشناس کے نام سے شائع ہوں۔

"قند مکرر" کے تحت سب سے عمدہ تحریر مشتاق احمد یوسفی کی ہے جو فیض احمد کی مدح میں ہے۔ لکھتے ہیں: "کسی کی غیبت اور برائی نہیں سن سکتے۔ کوئی ان کے سامنے ادبدا کر کسی کا ذکر بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب کا سوئچ آف کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا، آج کل کیا لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی! میں نے کہا، فرصت اور فراغت تو بہت ہے، کاہل ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعے کی عیاشیوں میں پڑ گیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں مزہ آنے لگے تو سمجھئے، حرام خوری پر اتر آیا ہوں۔ میں خود کو بہت دیر تک اسی طرح برا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اتنے قریب آ گئے کہ ان کے سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی۔ کہنے لگے، بھئی ہم کسی کی غیبت نہیں سن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں، اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجئے۔ درگزر ثواب کا کام ہے۔"

"سوغات" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حمید نسیم کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ حمید نسیم نے پچھلے چھ سات برسوں میں نقاد کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل کی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ پیشہ ور نقاد نہیں ہیں اور ان کا کسی مخصوص ادبی گروہ یا کسی نام نہاد مکتب فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب ان کے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں، زندگی کو درپیش بہت سے مسائل کا حل ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ادب ان کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جب تنقید لکھتے ہیں تو اپنے موضوع کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم نہیں کرتے اور پھر اسی رائے کے حق میں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

وکیلوں کی طرح دلیلوں کے انبار نہیں لگاتے بلکہ ایک صاحب نظر قاری کی حیثیت سے دوران مطالعہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں، اسے قلم بند کرتے جاتے ہیں تاکہ ان کے مطالعے میں دوسرے بھی شریک ہو سکیں۔

حمید نسیم نے چونکہ تاریخ، فلسفہ، فنون لطیفہ، ادیان عالم اور عالمی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اس لئے ادب کے حوالے سے وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس کا علمی معیار ہمارے عام تنقیدی معیاروں سے مختلف ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ تنقید نہیں لکھتے، اپنے موضوع کو تخلیقی سطح پر از سر نو دریافت کرتے ہیں۔ اس طریق کار کی وجہ سے ان کی آراء، ان لوگوں کے لئے عموماً ناقابل قبول ہوتی ہیں جو تنقید کو اس کے روایتی سانچوں اور ڈھانچوں سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں اور یہ کوئی غلط بات بھی نہیں ہے۔ ادب میں رد و قبول کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ حمید نسیم سے اگر کوئی اختلاف کرتا ہے یا خود حمید نسیم کسی سے اختلاف کرتے ہیں تو ادب کے حق میں یہ ایک اچھی بات ہے۔ اختلاف رائے سے فکر و نظر کے بہت سے گوشے منور ہوتے ہیں۔

حمید نسیم نے "ایک اہم شاعر" کے عنوان سے "سوغات" میں مجید امجد پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں انہوں نے شاعر کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ فیض، راشد اور میراجی کی سطح کا شاعر نہیں ہے۔ اس نتیجے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہئے کہ ہر شخص کسی بھی فنکار کو اپنے نقطۂ نظر سے جانچنے کا حق رکھتا ہے لیکن بعض لوگ جو مجید امجد سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں، وہ حمید نسیم کے اس مضمون سے خوش نہیں ہیں۔ اس مضمون کے تعلق سے ماہنامہ "نردبان" سرگودھا میں ایک دلچسپ اداریہ لکھا گیا ہے جس میں حمید نسیم پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے مجید امجد کی شاعرانہ عظمت کو کم کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور ان کی تنقید، تنقیص کی سطح پر آ گئی ہے۔ مدیر "نردبان" نے اپنے قارئین کو دعوت دی ہے کہ "وہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ مجید امجد کے ادبی قد کو کم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے اور حمید نسیم کو اس کار خیر کے لئے کس ادبی گروہ نے منتخب کیا ہے۔"

مدیر "نردبان" کی مجید امجد سے عقیدت برحق مگر حمید نسیم جیسے گوشہ نشین کو کسی ادبی گروہ کا آلہ کار سمجھنے سے مجید امجد کے شاعرانہ قد و قامت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ان عقیدت مندوں سے

پوچھا جا سکتا ہے کہ حمید نسیم کے مضمون پر تو آپ چراغ پا ہو گئے مگر اس وقت آپ کی عقیدت کہاں تھی، جب اختر الایمان نے یہ کہا تھا کہ مجید امجد میرا انقال ہے۔ اور سلیم احمد نے یہ کہا تھا: "مجید امجد کے مرنے کے بعد نعرہ بازی کی شکل میں پروپیگنڈہ شروع کیا گیا جس میں انہیں کبھی میر اور غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر اور کبھی تین سو سال کا سب سے بڑا شعری ذہن قرار دیا گیا۔ جب ایسی ننگی پبلسٹی کی جاتی ہے تو میری روح اس سے انکار کر دیتی ہے۔"

مجید امجد کے مداحوں میں محمود ایاز کا نام سرفہرست ہے۔ "سوغات" کے زیر نظر شمارے کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں: "مجید امجد یقیناً ایک اہم جدید شاعر تھے اور ان کی قدر شناسی اور جدید شاعری میں ان کے مقام اور مرتبے کا تعین ضروری تھا، لیکن قدر شناسی کی ان کوششوں کا ایک افسوس ناک پہلو بھی تھا۔ انتہا پسندی شاید ہمارے مزاج کا خاصہ ہے۔ لکھنے والے اپنا احساس توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور مجید امجد کی تعریف و توصیف میں مبالغے کی عنصر بعض اوقات مضحکہ خیز حد کو پہنچ گیا۔ اس طرح کے مضامین پڑھ کر مجھ جیسے مجید امجد کے قدیم مداحوں کو بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

مجید امجد سے عقیدت رکھنے والوں کو ہم سلیم احمد اور محمود ایاز کے فرمودات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے "نردبان" کے سرپرست ڈاکٹر انور سدید سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے لشکریوں کو مناسب ہدایات جاری کریں تاکہ وہ اپنی توپوں کا رخ ساقی فاروقی، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر سلیم اختر ہی کی طرف رہنے دیں، حمید نسیم کے خلاف نیا محاذ نہ کھولیں، اس طرح بارود خواہ مخواہ ضائع ہوگا۔

اختلاف رائے کی بات چلی ہے تو یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "سوغات" میں پروفیسر آل احمد سرور کے نام اثر لکھنوی اور پطرس بخاری کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں، ان میں سرور صاحب کی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کسی مصلحت سے کام نہیں لیا گیا۔ اثر لکھنوی نے تو سرور صاحب کے کلام پر اصلاح دینے سے بھی دریغ نہیں کیا اور پطرس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک سخت گیر نقاد ہی کہہ سکتا تھا اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد اس خوبصورت انداز میں معذرت بھی پیش کر دی: "میری کوئی بات ناگوار گزرے تو لہٰذا معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی بڑائی اسی میں سمجھتا ہوں کہ ہم جیسے بے کار، آپ جیسے سے متعلق جو منہ میں آئے کہا کریں اور آپ ماتھے پر بل نہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

آنے دیں۔ پھر اگر کوئی شخص مداح و معترف ہو اور بر سبیل تذکرہ نکتہ چینی بھی کر بیٹھے تو آپ کو درگزر کرنا چاہیے۔ میرا خط رشید صاحب کو دکھا دیجیے، جہاں وہ مجھ سے متفق نہ ہوں وہ فقرہ قلم زد کر دیجیے، تاکہ قیامت کے دن میں اسے اپنے بائیں ہاتھ میں نہ پاؤں۔"

یہ سرور صاحب کی وسیع الظرفی ہے کہ انہوں نے ان خطوط کو نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ چھپوا بھی دیا۔

ملفوظات نثر اللہ خان

جب یہ معلوم ہوا کہ کراچی یونیورسٹی کے قدیم طلبہ کی انجمن "یونی کیرین" منفرد کالم نگار نصر اللہ خان کی ۷۵ ویں سالگرہ کے سلسلے میں ان کے ساتھ ایک شام منا رہی ہے تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ یہ خوشی کی بات ہی تو ہے کہ ہمارے ملک میں حکومت کے علاوہ ایک اور ادارہ بھی جو ۷۵ سال کی عمر کے لوگوں کو لائق التفات سمجھتا ہے۔ حکومت نے نواز شریف کے والد کے ساتھ اور یونی کیرین نے نصر اللہ خان کے ساتھ محبت کا جو سلوک کیا ہے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ورنہ آج کل تو مردم شناسی کا یہ حال ہے کہ جونہی آدمی کا شمار بالغوں میں ہوا، اسے آثار قدیمہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ حالت ہے کہ ادھر کسی نومولود نے صبح دم دروازۂ خاور کھلتے ہی کھلونے کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا اور دوپہر تک اس کا شمار ممتاز ادیبوں میں ہونے لگا اور دروازۂ خاور بند ہونے سے پہلے پہلے اس کے ساتھ شام منا ڈالی گئی۔ شام بھی ایسی جس میں مقررین طلاقت لسانی اور جوش ثنا خوانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دکھاتے ہیں کہ ایسا ادیب اردو زبان کی تاریخ میں پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ پیدا ہونے والوں کے ساتھ ساتھ پیدا نہ ہونے والوں کی قسمت کا فیصلہ اس طرح کر دیا جاتا ہے جیسے قسمتوں کے فیصلے کرنا مقررین ہی کی قسمت میں لکھا ہو۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خان صاحب سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ خان صاحب اکثر مولوی صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے اور گھنٹوں ان سے باتیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب سب کام چھوڑ کر خان صاحب کی باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب نے ان سے کہا، آپ جیسی عمدہ نثر لکھتے ہیں، ویسی ہی عمدہ نثر بولتے بھی ہیں۔ آپ کا نام "ن" سے نہیں "ث" سے ہونا چاہیے۔ خان صاحب کب چوکنے والے تھے، جواب دیا۔ میرا اصل نام

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نثر اللہ ہی تھا، کتابت کی غلطی سے نصر اللہ ہو گیا۔ اسی غلط العام کو فصیح سمجھا جاتا ہے۔

ہمارا تجربہ بھی یہی ہے کہ خان صاحب جتنے خوش گفتار ہیں، اتنے ہی خوش نویس بھی ہیں۔ ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ لفظ ان کی زبان پر اچھے لگتے ہیں یا ان کے قلم کی زبان پر۔ ان کی تحریر پڑھیں تو جی چاہتا ہے پڑھتے ہی چلے جائیں۔ ان کی باتیں سنیں تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ افسوس کہ خان صاحب کی خوش گفتاری کو محفوظ نہیں رکھا گیا۔ کاش انہیں کوئی باسویل مل جاتا جو ہر محفل میں ان کے ساتھ ہوتا اور ان کی باتیں لکھتا جاتا۔ باتوں کا یہ مجموعہ جب "ملفوظات نثر اللہ خان" کے نام سے چھپتا تو معلوم ہوتا کہ لکھے ہوئے لفظ کی طرح بولے ہوئے لفظ میں بھی بڑی قوت ہوتی ہے۔

خان صاحب کی خوش گفتاری کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں چونکہ اس کالم کو مجموعہ لطائف بنانا مقصود نہیں ہے، اس لئے صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ ایک محفل میں ایک صاحب جن کی خان صاحب سے بڑی بے تکلفی تھی، اپنی بیوی کے ساتھ خان صاحب کے قریب بیٹھے تھے۔ نہ جانے انہیں کیا سوجھی، اپنی عمر رسیدہ بیوی کو خوش کرنے کے لئے خان صاحب سے کہنے لگے، دیکھئے، میری بیوی اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں لگتیں۔ خان صاحب نے پہلے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر شوہر کی طرف اور یہ کہا "یہ عمر آپ نے ہجری سن کے حساب سے بتائی ہے، ورنہ عیسوی سن کے حساب سے تو یہ سترہ سال سے زیادہ کی نہیں ہیں۔"

خان صاحب گزشتہ آدھی صدی سے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے جتنا لکھا ہے، اتنا تو لوگ پوری زندگی میں پڑھتے بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے کم و بیش بارہ ہزار کالم لکھے ہیں، جن میں سے دس ہزار تو روزنامہ "حریت" میں چھپے ہیں۔ اس اخبار میں انہوں نے ۲۸ برسوں تک بلاناغہ کالم لکھا ہے۔ آندھی آئے، طوفان آئے، یہاں تک کہ ایڈیٹر کو نوکری سے نکال دیا جائے تب بھی خان صاحب کالم ضرور لکھتے تھے۔ ہاں، جس روز اخبار نہیں چھپتا تھا تو کالم بھی نہیں چھپتا تھا لیکن خان صاحب لکھ کر رکھ لیتے تھے۔ دوسرے روز اس زائد کالم کو اخبار میں اداریے کی صورت میں چھپوا دیتے تھے۔ خان صاحب کا مزاح اخبار کے اداراتی کالم میں بھی مزہ دے جاتا تھا۔ یہ جو آج کل ہمارے اخباروں میں اداریوں کی جگہ مزاحیہ کالم شائع ہوتے ہیں، اس کی داد خان صاحب ہی کو ملنی چاہئے کہ اس بدعت حسنہ کے وہی بانی ہیں۔

خان صاحب کی کالم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ ہم نے لکھا تھا کہ وہ ہمارے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جنہیں دیکھ کر بہت سوں نے لکھنا سیکھا اور بہت سوں نے چھوڑ دیا۔ جنہوں نے لکھنا چھوڑا انہوں نے کسی اور کے ساتھ نہیں خود اپنے ساتھ بھلائی کی۔ کسی اخبار میں کالم لکھنا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ کام ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اخباروں کے مالکان کے اشارۂ ابرو پر مرغ باد نما بن کر بانگیں دے سکے۔ کمال تو یہ ہے کہ لکھنے والا پڑھنے والوں کو اپنی ذات سے مایوس نہ ہونے دے۔ ہمارے عہد میں یہ کام صرف نصر اللہ خاں نے کر دکھایا ہے۔ وہ برس ہا برس سے ہر روز کالم لکھ رہے ہیں، اس دوران میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ پڑھنے والوں کو یہ محسوس ہو کہ خان صاحب کے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر خان صاحب کوئی پرانی بات بھی دہراتے ہیں تو وہ ان کے قلم کی زد میں آ کر نئی بات سے بھی زیادہ نئی لگتی ہے۔

کالم نگار کی حیثیت سے خان صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عام آدمی میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ وہ اس زمانے کے آدمی ہیں جب صحافی سیاسی جماعتوں یا سرکاری ایجنسیوں کے زر خرید نہیں ہوتے تھے۔ ان کے پاس ضمیر نام کی ایک چیز بھی ہوتی تھی، جس کی خرید و فروخت کا رواج نہیں تھا اور نہ اسے خالی مکان کی طرح کرائے پر دیا جا سکتا تھا۔ خان صاحب نے شروع دن سے وہی کچھ لکھا جسے انہوں نے اپنے ضمیر اور اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر درست پایا۔ اسی لئے ان کی تحریروں کا سونا کبھی زر کم عیار ثابت نہ ہوا۔

خان صاحب نے اپنے کالموں کے ذریعے عام آدمی کو سیاسی معاملات میں باشعور بنانے کے ساتھ ساتھ سیاست دانوں کو بھی ان کی غلطیوں پر ٹوکا۔ "حریت" کے زمانے کے ۲۸ برسوں میں شاید ہی کوئی سیاست دان اور حکمران ہوگا جسے خان صاحب نے اپنے طنز و مزاح کا ہدف نہ بنایا ہو، اور یہ ثابت نہ کیا ہو کہ اتنی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والے کتنی نچلی سطح پر زندہ رہتے ہیں۔

خان صاحب کی کالم نگاری سے ہماری صحافت کو تو بہت فائدہ پہنچا لیکن خود خان صاحب خاصے گھاٹے میں رہے۔ وہ اس طرح کہ کالم نگاری ان کے دیگر کمالات کا پردہ بن گئی۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی ادیب کی ایک حیثیت اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی دوسری حیثیتوں کی طرف نظر

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نہیں جاتی۔ مولانا ظفر علی خان جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے، لیکن ان کی شاعری ذہنوں پر ایسی مسلط ہوئی کہ ان کی نثر نگاری کو فراموش کر دیا گیا۔ پطرس کی مزاح نگاری کی ایسی دھوم ہوئی کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد بھی ہیں اور ان کی سنجیدہ تحریریں، ان کی مزاحیہ تحریروں سے کئی گنا زیادہ ہیں اور نہایت فکر انگیز ہیں۔ اسی طرح نصر اللہ خاں کا نام لیجئے تو ذہن میں صرف ایک بے مثال کالم نگار کا تصور ابھرتا ہے حالانکہ وہ ڈرامہ نویس اور شخصی خاکہ نگار بھی بے مثال ہیں۔ خان صاحب نے ریڈیو پاکستان کے لیے تین درجن سے زیادہ ڈرامے لکھے جنہیں ریڈیو ڈرامے کی تاریخ میں سنگ ہائے میل کی حیثیت حاصل ہے۔

خان صاحب کی شخصی خاکہ نگاری تفصیلی تذکرے کی مستحق ہے، اس سے پہلے یہ بتا دیا جائے تو بہتر ہوگا کہ آج کل اس صنف ادب کا بھی وہی حال ہے جو دوسری اصناف ادب کا ہے۔ یعنی لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ لوح ادب پر حرف مکرر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے ایسے شخصی خاکے بھی پڑھے ہیں جن میں موضوع کا ذکر صرف عنوان کی حد تک رہتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مشہور مصنف نے مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھا تھا جس میں انہوں نے سارا زور قلم خود اپنی شخصیت کو بے نقاب کرنے میں صرف کر دیا تھا۔ اپنی شخصیت سے جو نقاب انہوں نے اتارا تھا، اسے مولوی عبدالحق کی شخصیت پر ڈال دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے موصوف نے مولوی صاحب کا خاکہ نہیں لکھا بلکہ مولوی صاحب نے ان کی شخصیت پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ خاکہ پڑھ کر ہم نے جناب مصنف سے عرض کیا "اس خاکے میں مولوی عبدالحق تو کہیں نظر نہیں آتے ہر طرف آپ ہی آپ جلوہ گر ہیں۔" انہوں نے فرمایا، مولوی صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں جو شخصی خاکے لکھے ہیں، ان میں بھی تو وہ خود کہیں نظر نہیں آتے، میں نے بھی ان کی تقلید کی ہے۔

شخصی خاکے مرحومین کے بھی لکھے جاتے ہیں اور زندہ لوگوں کے بھی، مرحومین کے بارے میں جھوٹ بولنا جتنا آسان ہوتا ہے، زندوں کے بارے میں سچ بولنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے بعض خاکہ نگاروں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ خامیاں تو مرحومین کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں اور خوبیوں سے زندہ شخصیات کو مزین کیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مرحومین تو حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتے، لیکن زندہ افراد اپنی مجوزہ

خوبیوں کے مطابق اپنے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خان صاحب کی خاکہ نگاری "چیزے دیگر" ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کو پس منظر میں رکھا ہے اور اپنا ذکر صرف اس حد تک کیا ہے جس حد تک ناگزیر تھا۔ ایک خاکہ بھی ایسا نہیں لکھا جسے پڑھ کر یہ خیال آئے کہ انہوں نے کسی اور کے پردے میں اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے آرائش بیان سے بھی کام نہیں لیا حالانکہ انہوں نے جتنے خاکے بھی لکھے ہیں، وہ مرحومین کے ہیں، اگر وہ چاہتے تو بلا خوف تردید بے شمار ایسے واقعات لکھ سکتے تھے جو ظہور میں نہ آئے ہوں۔

خان صاحب کے خاکوں کا مجموعہ دس سال پہلے "کیا قافلہ جاتا ہے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں باون شخصیات کی قلمی تصویریں ہیں۔ ان میں علماء بھی ہیں اور سیاست دان بھی۔ ادیب بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ ان سب کو خان صاحب نے اپنی یادوں کے حوالے سے دیکھا ہے اور ایک ایسی محفل آراستہ کی ہے جس میں سب ہی چہرے آشنا ہیں۔ پہلے ان چہروں کو ہم دور سے دیکھتے تھے اور اب خان صاحب کی عنایت سے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

یوں تو اس کتاب میں شامل سب ہی خاکے کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں، لیکن بعض خاکے اس لئے خصوصی توجہ کے مستحق ہیں کہ ان سے متعلقہ شخصیات کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً مشہور اشتراکی کارکن اور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے بارے میں خان صاحب نے بتایا ہے کہ جب وہ صاحب زادہ محمود الظفر سے شادی کے بعد امرتسر آئیں تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شوہر کے دادا نواب نجیب الدولہ کی تصویر پر اس زور سے گلدان مارا کہ شیشہ بھی ٹوٹ گیا اور تصویر بھی پھٹ گئی۔ اس حرکت کی وجہ یہ تھی کہ وہ اشتراکیوں کے گھر میں کسی "نواب" کی تصویر پسند نہیں کرتی تھیں۔

خان صاحب نے ڈاکٹر رشید جہاں اور فیض احمد فیض کے باہمی تعلقات کی نوعیت ان الفاظ میں بیان کی ہے "تاثیر اور فیض سے رشید جہاں کے گہرے مراسم تھے۔ فیض کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بڑے شرمیلے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ مکھی مکڑی کے جال میں پھنس گئی۔ ایک فیض ہی کیا، ایسے کئی فیض، رشید جہاں کے حسن بیان اور ان کی تعلیمات کا اثر قبول کر کے کمیونسٹ ہو گئے۔ یوں سمجھئے کہ فیض بچہ تھا اور رشید ان کی لاتھیں۔ ان کو لوریاں دیتیں۔ تھپک تھپک کر مارکسی

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نغمے سناتیں اور مارکسی خواب دکھایا کرتی تھیں اس خواب ناک ماحول میں فیض بھلا پہلے سے فیض کہاں رہتے، بھرپور جوانی تھی۔ بہک جانے کے مواقع اور اسباب بہت تھے غرض کہ فیض کو رشید جہاں نے بالکل بدل ڈالا ایک فیض ہی کیا، امرتسر اور لاہور کا جو بھی جوان ان کے قریب آیا، وہ ان کا ہو گیا اور ان کے راستے پر لگ گیا۔

اسی طرح منٹو کے بارے میں بھی انہوں نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے ''منٹو قلم اور کتاب چور تھا۔ اگر اس کی جیب میں کتاب خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے تو وہ چوری کرتا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اچھا قلم اور اچھی کتاب جہاں بھی دیکھتا، اڑا لیتا۔''

خان صاحب کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جسے اچھی کتابیں پڑھنا کا شوق ہے۔ خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں تو منٹو کی طرح چرا کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

بڑے ادیب دنیا کی ہر زبان میں ہوتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر۔ اردو میں بڑے ادیب ناپید ہیں، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ڈنکے کی چوٹ والے نہیں، واوین اور قوسین والے۔ واوین والے بڑے ادیب وہ ہیں جن کے ناموں سے پہلے لفظ ''بڑا'' واوین میں لکھا جاتا ہے، اور قوسین والے وہ ہیں جن کے نام کے بعد قوسین میں لکھنا پڑتا ہے کہ یہ ادیب ہیں۔ افسوس کہ اب اردو میں واوین اور قوسین کا استعمال بھی بہت کم ہوتا جا رہا ہے، نتیجہ یہ کہ کسی ادیب کی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے سوالیہ یا استعجابیہ نشانات سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد ہم بھول گئے کہ کس موضوع پر لکھنے کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی ہے۔ یقیناً کوئی اہم مسئلہ ہوگا جو ذہن سے نکل گیا۔ آج کل اہم مسائل ذہن سے تو کیا، چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے بھی پھسل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح احمد بشیر کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' کشور ناہید کے ہاتھ سے پھسل کر ان کے کالم میں گر پڑی ہے جو انہوں نے لاہور کے اخبار ''جنگ'' میں لکھا ہے۔ اس کے جواب میں احمد بشیر نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور کشور ناہید کے خلاف ایک بیان چھپوایا ہے۔ بڑے ادیبوں کی اس لڑائی میں ہم جیسے چھوٹوں کو دخل نہیں دینا چاہئے کہ بقول اسماعیل میرٹھی، جب دو بڑوں میں کھٹ پٹ ہو تو چھوٹوں کو شعر کے دوسرے مصرعے میں کی گئی نصیحت (اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ) پر عمل کرنا چاہئے۔ لیکن ہمارے عمل کرنے سے پہلے ہی ان دونوں بڑوں نے اپنی لڑائی میں ہمیں گھسیٹ لیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی صفائی میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

کشور ناہید بلاشبہ ہمارے ملک کی ذہین ترین خواتین میں سے ہیں، بشرطیکہ ذہانت کا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

معیار وہی ہو جو ان کی شاعری کا ہے۔ شاعری میں انہوں نے جو نام پیدا کیا ہے، وہ ان کا حق ہے۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقا بائی چندا کے بعد وہ دوسری شاعرہ ہیں، جنہوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ شاید ایسے ہی کسی راستے کے بارے میں شاعر نے کہا تھا

ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گمراہی بھی ایک راستہ ہے

کشور ناہید کی ذہانت نے کالم نگاری میں انفرادی شان پیدا کی ہے۔ وہ موجودہ دور کے بہترین کالم نگاروں میں سے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کالم نگاری کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری پر ان کی کالم نگاری کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ ان کا کبھی کوئی مصرع زبان زد خاص نہیں ہوا، مگر کالموں کے بعض بعض جملے غالب کے شعروں کی طرح، غالب ہی کے لفظوں میں (اور غالب ہی سے معذرت کے ساتھ) ''محبوب خلائق'' ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں ''یادیں کہ زہر پہ لگا ورق'' کے عنوان سے انہوں نے جو کالم لکھا تھا، اس کا ایک جملہ تو بازار ادب میں سکۂ قلب کی طرح گردش میں ہے۔ فرماتی ہیں: ''احمد بشیر کو تو یہ ہنر آتا ہے، وہ جس لفظ کو ہاتھ لگاتے ہیں، وہ گالی بن جاتا ہے۔''

احمد بشیر نے اس کے جواب میں ایک اخباری بیان جاری کیا ہے جو ۳۰ - جون ۱۹۹۶ء کے روزنامہ ''جنگ'' لاہور'' میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے: ''کشور ناہید کے بارے کوئی کلمۂ خیر کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس کی یہ بات درست ہے کہ میں گالی دیتا ہوں مگر وہ خود بھی تو گالی دیتی ہے۔ اس لئے میں اسے ماں صدقے واری کیسے لکھ سکتا ہوں۔ وہ ایک باغی عورت ہے مگر لائق عورت بھی ہے۔ میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا، وہی بلا کم و کاست اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے، منافقت سے کام نہیں لیا۔''

کشور ناہید نے احمد بشیر کے بارے میں جو جملہ لکھا ہے، وہ ایک خوبصورت شعر کی طرح معنی خیز ہے۔ احمد بشیر کا جواب بے مزہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کشور ناہید کو کوئی نثری نظم سنا رہے ہوں اور وہ بھی خود کشور ناہید کی ادبیے موصوفہ نے جو بات کہی ہے، وہ صدفی صد درست ہے کیونکہ احمد بشیر نے اپنی کتاب میں جس بھیانک انداز سے کشور ناہید کی کردار کشی کی ہے، اس کی کوئی

دوسری مثال کم از کم اردو زبان میں نہیں ملتی۔ کشور ناہید نے اسے ''زہر پہ لگا ورق'' کہا ہے، حالانکہ یہ ورق پہ لگا زہر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ احمد بشیر نے ان لوگوں کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کی ہیں جن کا ذکر کشور نے اپنی آپ بیتی ''بری عورت کی کتھا'' میں بڑی محبت سے کیا ہے۔ مثلاً اس کتاب کے ایک باب میں آٹھ عدد عشاق کا ذکر ہے۔ احمد بشیر ان عشاق کے بارے میں لکھتے ہیں یقیناً یہ آٹھوں کے آٹھوں نابینا ہوں گے۔ یہ صریحاً غلط بیانی ہے۔ یہ نابینا نہیں نارسیدہ تھے کہ ان سب نے خودکشی کر لی۔ ایسے ہی مجانین کی مرگ ناگہاں پر میر تقی میر کی عقل گم ہوا کرتی تھی۔ اپنے کالم میں کشور ناہید نے احمد بشیر کے ساتھ انیس ناگی اور حمید اختر کو بھی آتش زیر پا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں لکھتی ہیں: ''انیس ناگی کو یہ ہنر آتا ہے کہ منفی رویوں کو ضرب کرتے کرتے بے حال ہو جاتے ہیں۔ حمید اختر ہر فقرے کو کسی اور شخصیت کی سند کو ساتھ پیش کرتے ہوئے یہ التزام رکھتے ہیں کہ کوئی لطیفہ، سنسنی خیزی، ممنوعات کے حوالے مرحلہ وار پیش کرتے ہیں۔''

انیس ناگی کے خلاف تو کشور ناہید کو لکھنا ہی چاہئے تھا کہ اس سادہ مزاج نے اپنی آپ بیتی میں کشور ناہید پر چھینٹے اڑائے ہیں اور گیارہویں گریڈ سے ایک دم اکیسویں گریڈ میں چھلانگ لگانے کو تعجب و حیرت ہی کی نظر سے نہیں، رشک و حسد کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے۔ مگر حمید اختر نے کیا جرم کیا تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کشور ناہید نے ان کے خلاف جو فرد جرم عائد کی ہے، اس کی زبان کا اسلوب پریس کے روزنامچے جیسا ہے کہ لفظ موجود ہیں اور مفہوم مفقود'' پیش کرتے ہوئے..... پیش کرتے ہیں'' بھی زبان کی داد دیتے ہوئے حمید اختر کو بھی ایک اخباری بیان کے ذریعے اپنا دفاع کرنا پڑا۔ ان کا بیان، احمد بشیر کے مندرجہ بالا بیان کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' کے حوالے سے کہا ہے: ''میری یہ کتاب آٹھ سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ لگتا ہے کشور ناہید نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ محض اخباری تبصروں کو پڑھ کر رائے قائم کی ہے۔'' حمید اختر بھی انیس ناگی کی طرح خاصے سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں۔ لوگ تو آج کی چھپی ہوئی کتابیں نہیں پڑھتے تو آٹھ سال پہلے کی چھپی ہوئی کتاب کون پڑھے گا اور پھر کتاب پڑھ کر رائے دینا کون سا کمال ہے۔ یہ کام تو ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے کوئی اور کام نہ ہو۔ ہاں جو لوگ سرکاری خرچ پر ادبی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل طے کرنے کے سلسلے میں زمین کا گز بن چکے ہوں،

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ان کے لئے کتابیں پڑھ کر رائے دینا، ان کے منصب اور مرتبے کے شایان شان نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ کشور ناہید نے حمید اختر کی کتاب کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے، اسے پتھر کی لکیر سمجھا جائے، لہٰذا حمید اختر کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ:

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

کشور ناہید نے زہر پہ ورق لگاتے ہوئے کالم نگاروں کا بھی حساب برابر کر دیا ہے۔ احمد بشیر، حمید اختر اور انیس ناگی کی نگارشات کو "بے لگام تحریریں" قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"بے لگام تحریروں کے اس سمندر کو فزوں کرنے والے کچھ وہ کالم نگار بھی ہیں جو اپنے حصے کے نام کبھی بدلہ لینے کو کبھی بغض نکالنے اور کبھی سرخیاں بنانے کو نکال لیتے ہیں۔ ان پہ کیا اعتراض، یہ تو ان کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کون جائے گا عدالت مقدمہ کرنے، کس کے پاس وقت ہے کہ عدالت میں بیٹھ کر پیروی کر سکے تو رہے گا یہی طوفانِ تحریر۔"

ہماری ناقص رائے میں اگر آپ کے پاس نثری نظمیں لکھنے اور زہر پہ ورق لگانے کے لئے وقت ہے تو پھر عدالت میں جانے کے لئے وقت نکالنا کونسا مشکل کام ہے۔ کالم نگاروں پر مقدمہ دائر کرنے سے پہلے احمد بشیر وغیرہ پر مقدمہ دائر کرنا چاہئے کہ انہیں لوگوں کی وجہ سے بعض شرپسندوں کو کالم آرائی کرنے کا موقع ملا ہے۔ ویسے ان شرپسندوں کی روٹی کا کوئی آبرومندانہ حل تلاش کرنے سے بھی دو رفتہ بند کیا جا سکتا ہے۔ ان شرپسند کالم نگاروں کو اگر نیشنل بک فاؤنڈیشن یا پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس جیسے سرکاری خیراتی اداروں میں ملازمتیں مل جائیں تو یہ اپنی حرکتوں سے باز آ سکتے ہیں۔ کم از کم اپنی حد تک ہم یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہمیں کسی سرکاری خیراتی ادارے میں روزگار مل جائے تو ہم کالم نگاری چھوڑ کر شاعری شروع کر دیں گے۔ پھر ہم لوگوں کے قصیدے لکھ کر انہیں خوش کیا کریں گے۔

احمد بشیر نے کشور ناہید کی طرح ہوا میں تیر نہیں چلائے، از راہِ لطف و کرم ہمیں براہِ راست ایک عدد محبت وثیقہ سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسے "تکبیر" میں شائع کر دیا جائے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"میں نے اپنے آپ کو کبھی ادیبوں کے قبیلے میں شامل نہیں سمجھا مگر صحافت میں کوچہ گردی کے بعد یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جب قاری کو یہ خیال گزرے کہ لکھنے والا فلاں شخص

کے خلاف بغض رکھتا ہے اور ذاتیات پر اتر آیا ہے تو پھر وہ اس کی بات نہیں سنتا اور تحریر ضائع ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی آپ نے کرم کیا اور میری کتاب پر جو یونس جاوید نے مرتب کی، آپ نے اتنی زبردست توجہ کی۔ لاہور کے تمام بڑے مولویوں نے جن میں مولانا عبدالقادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا مرتضیٰ ملک فاضل مدینہ، مولانا عبدالقدیر اور دوسرے علماء کرام نے اس روسیاہ کو اسی کتاب پر واجب القتل قرار دیا ہے اور کتاب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ شرعی حد جاری کی ہے اور اگر میں توبہ کروں تو کوڑے مارنے کا حکم لگایا ہے۔

آپ نے کم از کم یہ تو نہیں کیا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے؟

کیا "جو ملے راستے میں" اتنی اہم کتاب تھی؟

آپ کا خوشہ چین نیاز مند

احمد بشیر

۵۰-ای

عسکری فلیٹس والٹن، لاہور

اب اگر آپ صاحب دل و دماغ ہیں تو تکبیر میں اس خط کو شائع کروا دیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑیں۔

اس گرامی نامے کا جواب ہم نے نہایت ادب سے لکھا تھا اور ۲۵-جون کو پوسٹ کیا تھا۔ اس میں عرض کیا تھا کہ آپ نے ذاتیات پر اترنے اور دل میں بغض رکھنے کا جو الزام لگایا ہے، وہ ہمارے حق میں سخت ناانصافی ہے۔ آپ سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ سرے سے کبھی واسطہ ہی نہیں رہا تو پھر بغض ہو تو کیوں؟ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ کالم اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ اس کی سب سے زیادہ داد آپ سے ملے گی کیونکہ آپ بطور صحافی اپنے لئے ہی نہیں، دوسروں کے لئے بھی آزادیٔ رائے کا حق طلب فرماتے رہے ہیں۔ آپ نے دوسروں کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا، اپنی کتاب میں لکھا، کیا ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ کی کتاب کے متعلق وہی کچھ لکھیں جو ہم نے محسوس کیا۔

احمد بشیر صاحب نے مذکورہ خط کالم کی پہلی قسط پڑھ کر لکھا تھا۔ توقع تھی کہ وہ ہمارے خط

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ان کے لئے کتابیں پڑھ کر رائے دینا، ان کے منصب اور مرتبے کے شایان شان نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ کشور ناہید نے حمید اختر کی کتاب کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے، اسے پتھر کی لکیر سمجھا جائے، لہٰذا حمید اختر کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ:

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

کشور ناہید نے زہر پہ ورق لگاتے ہوئے کالم نگاروں کا بھی حساب برابر کر دیا ہے۔ احمد بشیر، حمید اختر اور انیس ناگی کی نگارشات کو "بے لگام تحریریں" قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"بے لگام تحریروں کے اس سمندر کو فزوں کرنے والے کچھ وہ کالم نگار بھی ہیں جو اپنے حصے کے نام کبھی بدلہ لینے کو کبھی بغض نکالنے اور کبھی سرخیاں بنانے کو نکال لیتے ہیں۔ ان پہ کیا اعتراض، یہ تو ان کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کون جائے گا عدالت مقدمہ کرنے، کس کے پاس وقت ہے کہ عدالت میں بیٹھ کر پیروی کر سکے تو رہے گا یہی طوفان تحریر۔"

ہماری ناقص رائے میں اگر آپ کے پاس نثری نظمیں لکھنے اور زہر پہ ورق لگانے کے لئے وقت ہے تو پھر عدالت میں جانے کے لئے وقت نکالنا کونسا مشکل کام ہے۔ کالم نگاروں پر مقدمہ دائر کرنے سے پہلے احمد بشیر وغیرہ پر مقدمہ دائر کرنا چاہئے کہ انہیں لوگوں کی وجہ سے بعض شرپسندوں کو کالم آرائی کرنے کا موقع ملا ہے۔ ویسے ان شرپسندوں کی روٹی کا کوئی آبرومندانہ حل تلاش کرنے سے بھی دروفتنہ بند کیا جا سکتا ہے۔ ان شرپسند کالم نگاروں کو اگر نیشنل بک فاؤنڈیشن یا پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس جیسے سرکاری خیراتی اداروں میں ملازمتیں مل جائیں تو یہ اپنی حرکتوں سے باز آ سکتے ہیں۔ کم از کم اپنی حد تک ہم یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہمیں کسی سرکاری خیراتی ادارے میں روزگار مل جائے تو ہم کالم نگاری چھوڑ کر شاعری شروع کر دیں گے۔ پھر ہم لوگوں کے قصیدے لکھ کر انہیں خوش کیا کریں گے۔

احمد بشیر نے کشور ناہید کی طرح ہوا میں تیر نہیں چلائے، از راہ لطف و کرم ہمیں براہ راست ایک عدد محبت وثیقہ سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسے "تکبیر" میں شائع کر دیا جائے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"میں نے اپنے آپ کو کبھی ادیبوں کے قبیلے میں شامل نہیں سمجھا مگر صحافت میں کوچہ گردی کے بعد یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جب قاری کو یہ خیال گزرے کہ لکھنے والا فلاں شخص

کے خلاف بغض رکھتا ہے اور ذاتیات پر اتر آیا ہے تو پھر وہ اس کی بات نہیں سنتا اور تحریر ضائع ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی آپ نے کرم کیا اور میری کتاب پر جو یونس جاوید نے مرتب کی، آپ نے اتنی زبردست توجہ کی۔ لاہور کے تمام بڑے مولویوں نے جن میں مولانا عبدالقادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا مرتضیٰ ملک فاضل مدینہ، مولانا عبدالقدیر اور دوسرے علماء کرام نے اس روسیاہ کو اسی کتاب پر واجب القتل قرار دیا ہے اور کتاب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ شرعی حد جاری کی ہے اور اگر میں توبہ کروں تو کوڑے مارنے کا حکم لگایا ہے۔

آپ نے کم از کم یہ تو نہیں کیا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے؟

کیا "جو ملے راستے میں" اتنی اہم کتاب تھی؟

آپ کا خوشہ چین نیاز مند

احمد بشیر

۵۰-ای

عسکری فلیٹس والٹن، لاہور

اب اگر آپ صاحب دل و دماغ ہیں تو تکبیر میں اس خط کو شائع کروا دیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑیں۔

اس گرامی نامے کا جواب ہم نے نہایت ادب سے لکھا تھا اور ۲۵- جون کو پوسٹ کیا تھا۔ اس میں عرض کیا تھا کہ آپ نے ذاتیات پر اترنے اور دل میں بغض رکھنے کا جو الزام لگایا ہے، وہ ہمارے حق میں سخت ناانصافی ہے۔ آپ سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ سرے سے کبھی واسطہ ہی نہیں رہا تو پھر بغض ہو تو کیوں؟ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ کالم اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ اس کی سب سے زیادہ داد آپ سے ملے گی کیونکہ آپ بطور صحافی اپنے لئے ہی نہیں، دوسروں کے لئے بھی آزادی رائے کا حق طلب فرماتے رہے ہیں۔ آپ نے دوسروں کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا، اپنی کتاب میں لکھا، کیا ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ کی کتاب کے متعلق وہی کچھ لکھیں جو ہم نے محسوس کیا۔

احمد بشیر صاحب نے مذکورہ خط کالم کی پہلی قسط پڑھ کر لکھا تھا۔ توقع تھی کہ وہ ہمارے خط

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کے جواب میں دوسری قسط پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں گے لیکن انہوں نے ہمیں ایک خط سے زیادہ کا مستحق نہ سمجھا۔ بہرحال موصوف سے گزارش ہے کہ ہم نے اپنے کالم میں کوئی غلط بات لکھی ہو تو اس کی نشان دہی فرمادیں۔ ہم اپنا غلط نامہ ہی نہیں، معافی نامہ بھی شائع کردیں گے۔

شاعری یا راگ درباری

پرانے زمانے میں جب ریڈیو تھا نہ ٹی وی۔ اخبار شائع ہوتے تھے نہ کتابیں۔ اکادمی ادبیات تھی نہ اس قسم کے دوسرے رفاہی و خیراتی ادارے۔ شاعروں کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ وہ شاہی درباروں سے وابستہ ہو جاتے تھے اور قصیدے لکھا کرتے تھے۔ بادشاہ سلامت کے ہاں وارثِ تاج و تخت پیدا ہوا تو قصیدۂ جشنِ ولادت لکھ دیا۔ یہی وارث جب تخت پر بیٹھا تو قصیدۂ جشنِ تاج پوشی لکھ دیا۔ بادشاہ سلامت نے کسی مرضِ خفیفہ یا خبیثہ سے نجات پائی تو قصیدۂ جشنِ صحت لکھ دیا۔ یہ قصیدہ نگار نہ صرف ماہ بماہ تنخواہ پاتے تھے بلکہ انہیں ہر قصیدے پر انعام بھی ملتا تھا۔ سب سے بڑے قصیدہ نگار کو ملک الشعراء کا خطاب دیا جاتا تھا۔ یہ خطاب پانے والے کا درجہ ہفت ہزاری امراء کے برابر ہوتا تھا اور بعض ملک الشعراء تو ایسے گزرے ہیں جن کے سامنے ہفت ہزاری امراء بھی پانی بھرتے تھے۔

درباروں پر زوال آیا تو قصیدہ نگاری کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ درباروں کے ختم ہو جانے کا کوئی فائدہ ہوتا ہو، قصیدہ نگاری کا ختم ہو جانا ادب کے لئے سراسر نقصان کا باعث ہے۔ قصیدہ دراصل علم و فضل کے اظہار کا ذریعہ تھا۔ پرانے زمانے کے شاعر آج کل کے شاعروں کی طرح شاعری کو اخفائے علم کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے، خاصے پڑھے لکھے ہوتے تھے اور اپنے زمانے کے مروجہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے قصیدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اخلاق، سیاست، عدل، طریقت و شریعت اور توحید کے مسائل کے علاوہ طب، نجوم اور فلسفہ جیسے علوم سے متعلق گوناگوں مباحث ملتے ہیں۔ افسوس کہ قصیدہ نگاری کے خاتمے کے ساتھ ہماری شاعری کا دامن فکر انگیز مباحث سے خالی ہو گیا۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہم سمجھتے تھے کہ قصیدہ نگاری کا ماضی جتنا شاندار ہے، مستقبل اتنا ہی مایوس کن ہے بلکہ سرے سے کوئی مستقبل ہی نہیں ہے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری موجودہ جمہوری حکومت کا جو پرانی بادشاہتوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان تمام روایات کو از سر نو زندہ کر رہی ہے جن کا شمار بادشاہت کے لوازم میں ہوتا ہے، قصیدہ نگاری کا احیا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت ان شعراء کی سرپرستی کرے گی جو سربراہ حکومت کی شان میں قصیدے لکھیں گے۔ پہلا قصیدہ جو منظر عام پر آیا ہے، وہ یہ ہے:

محترمہ علیا بے نظیر بھٹو سلمہا
وزیر اعظم پاکستان کے لئے

فضل خدا سے آپ کا ہے نام بے نظیر
قوم و وطن کے حق میں کریں، کام بے نظیر
تاریخ میں بھی ہوگا بلند آپ کا مقام
دیں گے جزا بھی، خالق اجسام بے نظیر
آئے زباں پہ آپ کی، دل سے جو بات بھی
نوع بشر کے حق میں ہو پیغام بے نظیر
کشمیر کا ہو مسئلہ حل حسب آرزو
ملت کی خواہشوں کا ہوا اتمام بے نظیر
امن و اماں کی پھر ہو کراچی میں روشنی
ہوں دل کشی میں اس کے در و بام بے نظیر
منصوبہ بندیوں کا ہے آغاز، دل نواز
منصوبہ بندیوں کا ہوا انجام بے نظیر
اس کے کرم سے آپ نہ مایوس ہوں کبھی
میرے خدا کا ہے کرم عام بے نظیر
ممنون ہوگا عالم اسلام آپ کا
کر جائیں آپ خدمت اسلام بے نظیر

راغب کی یہ دعا ہے کہ دنیا میں آپ کی
ہر صبح بے مثال ہو ہر شام بے نظیر

جیسا کہ قصیدے کے آخری شعر سے ظاہر ہے، شاعر کا تخلص راغب ہے۔ اس تخلص کے چونکہ اور شاعر بھی ہیں، اس لئے ہم یہ قصیدہ اس کالم کے ساتھ بخط شاعر بھی شائع کر رہے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ شاعر کا پورا نام راغب مراد آبادی ہے۔ اور یہ وہ نام ہے جس کا چار دانگ ادب میں ڈنکا بج رہا ہے۔ ان جیسا قادر الکلام شاعر اردو کی تاریخ میں نہیں گزرا بشرطیکہ قادر الکلامی اور شاعری کو مترادف سمجھا جائے۔ طبع ایسی موزوں پائی ہے کہ ہر خیال کو، خواہ وہ بے خیالی ہی کا نتیجہ کیوں نہ ہو، منظوم کر دیتے ہیں۔ خیالات تو الگ رہے، وہ چاہیں تو بقول شخصے ٹیلی فون ڈائریکٹری اور فہرست رائے دہندگان کو بھی بحر ہزج مثمن سالم میں منتقل کر سکتے ہیں۔

یہ قصیدہ جیسا کہ عکس سے ظاہر ہے، ۲-جون ۱۹۹۶ء کو محترمہ بے نظیر کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ ٹھیک دو ماہ بعد اس قصیدے کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس کی تفصیل ۳-اگست ۱۹۹۶ء کے روزنامہ "جنگ" کراچی میں شائع ہوئی ہے جو یہ ہے:

"وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اہل علم سے اپنی محبت اور عقیدت کا مظاہرہ بارہا کیا ہے اور راغب مراد آبادی کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک لاکھ روپیہ دیا ہے..... راغب مراد آبادی نے وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ حکومت کی خصوصی توجہ سے اہل قلم کے مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔"

ادبی حلقوں میں اس قصیدے اور خبر کا ملا جلا ردعمل سامنے آیا ہے۔ بعض لوگوں نے راغب مراد آبادی کو مبارک باد دی ہے کہ انہوں نے سودا، مصحفی، انشا، غالب اور ذوق جیسے بڑے شاعروں پر فوقیت حاصل کر لی جنہیں زندگی بھر قصیدے لکھنے کا اتنا معاوضہ نہ ملا جتنا موصوف کو صرف نو شعروں پر مل گیا۔

بعض لوگوں نے حکومت کو مبارک باد دی ہے کہ اس نے ایک متروک صنف سخن کو از سر نو زندہ ہونے کا موقع دے کر ادب کی ترقی کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اور اب وہ دن دور نہیں جب غزلیات کے دواوین کی طرح قصیدوں کے دیوان بھی کثرت سے شائع ہونے لگیں گے اور ہر دیوان کی اشاعت پر اکادمی ادبیات انعام دیا کرے گی۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

البتہ بعض حسد شعارانِ ادب خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ راغب مراد آبادی نے قصیدے کا معاوضہ نہیں لیا، کراچی کے شہیدوں کا خون بہا وصول کیا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ قصیدے کے آخری شعر میں ہر صبح کے بے مثال اور ہر شام کے بے نظیر ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا اشارہ ان جعلی پولیس مقابلوں کی طرف ہے جن میں صبح و شام کراچی کے نوجوان شہید ہو رہے ہیں۔ کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان پولیس مقابلوں کے بعد جب شہادت کے لائق کوئی نوجوان باقی نہیں رہے گا تو شہر کے در و بام امن کی روشنی سے جگمگانے لگیں گے۔ پانچویں شعر میں امن و امان کی اسی روشنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن ہمیں ان باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ مندرجہ بالا خبر میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وزیر اعظم نے راغب مراد آبادی کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں نہ کہ رائج الوقت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ممکن ہے بعض ناواقف لوگ یہ سوال کریں کہ راغب صاحب کی ادبی خدمات تو ان کے قصیدے سے ظاہر ہیں، لیکن علمی خدمت کیا ہیں جن کو وزیر اعظم نے ایک لاکھ روپے کی حد تک پسند کیا ہے۔

نامحرمانِ رازِ درون مے خانہ علم کی آگاہی کے لئے عرض ہے کہ راغب صاحب کی علمی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ اس مختصر کالم میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ موصوف کے دریائے علم میں شناوری کی جائے۔ مختصراً عرض ہے کہ وہ علم عروض کے ماہر ہیں اگرچہ آج تک انہوں نے کسی غیر معروف یا غیر متداول بحر میں شعر نہیں کہا، اور اپنی عروضی مہارت کا کوئی دستاویزی ثبوت فراہم نہیں کیا، لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ موجودہ دور کے عروضی سمرقندی ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ایک مرتبہ عرض کیا تھا کہ موصوف کے کلام میں کوئی عروضی خامی اور کوئی غیر عروضی خوبی نہیں ملتی۔

راغب کا دوسرا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جوش ملیح آبادی کے بارے میں دو کتابیں مرتب کی ہیں جو "مکالماتِ جوش و راغب" اور "خطوطِ جوش" کے ناموں شائع ہو کر "مقبولِ خواص" ہو چکی ہیں۔ "مقبولِ عوام" اس لئے نہیں کہ یہ چوری چھپے فروخت ہوتی ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ "مکالمات" میں راغب کے سوالات اور جوش کے جوابات ہیں۔ یہ کتاب اس طرح وجود میں آئی کہ سائل ایک کاغذ پر کچھ سوالات لکھ لیتے اور جوش صاحب کو پڑھ کر سناتے۔ جو جواب ملتا، اسے سوال کے مقابل لکھ لیتے اور آخر میں جوابوں کے نیچے جوش سے دستخط

کرا لیتے تاکہ ان جوابات کے مستند ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔ اس کتاب میں یہی سوال اور جواب بصورتِ عکس شائع کئے گئے ہیں، چونکہ یہ سب راغب کے قلم سے ہے، اس لئے وہ اس کتاب کے مرتب ہی نہیں، کاتب بھی ہیں۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ خط ہے۔ افسوس کہ انہوں نے خطاطی کی طرف توجہ نہیں کی، ورنہ یہ فن ان کے لئے شاعری سے زیادہ مفید ہوتا۔

"مکالمات" میں بہت سے سوالات اور ان کے جوابات ایسے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی اقدار کے خلاف نفرت پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ مثلاً صفحہ ۷۳ پر ایک سوال ملتا ہے: "زبور، انجیل اور قرآن۔ ان تینوں کتب سماوی کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟" جوش صاحب کی طرف سے بقلم راغب یہ جواب لکھا گیا ہے: "کتب ارضی ہیں، سماوی نہیں۔" اس جواب کے نیچے جوش صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔ جواب جوش صاحب نے دیا تھا یا مرتب نے خود اضافہ کر لیا۔ بہر حال اصل واقعہ کچھ بھی ہو، قرآن شریف کو آسمانی کتاب کی بجائے ارضی کتاب کہنا اور اپنے قلم سے لکھ کر اس بات کو شائع کرنا، سلمان رشدی سے کم درجے کے کسی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ راغب صاحب سوال نامہ اس وقت پیش کیا کرتے تھے جب جوش صاحب جام و سبو سے شغل فرما رہے ہوتے تھے تاکہ ان سے سوالوں کے جواب حسبِ منشا حاصل کئے جا سکیں مگر جوش صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ نشے کی حالت میں بھی کبھی کبھی احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔ انہوں نے بعض ایسے سوالوں کے جواب نہیں دیئے جن سے سائل کی نیت کا فتور جھلکتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۷۳ پر جو سوال نامہ ہے، اس میں اس قسم کے سوالات بھی ہیں:

۱۔ عصمتِ انبیاء کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۲۔ قرآن مجید میں انبیاء کے جن معجزات کا تذکرہ ہے، ان کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

۳۔ اگر خلفائے ثلاثہ حق پر نہیں تھے تو امیر المومنین نے ان کے خلاف تلوار کیوں نہیں اٹھائی؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے سوالات کا مقصد کیا ہے۔ جوش صاحب محض ایک شاعر تھے، ان سے ادبی نوعیت کے موضوعات پر ہی گفتگو ہی کی جا سکتی تھی، ان کے سامنے ایسے سوال پیش کرنا، جن کے جوابات ان کی بساط سے باہر تھے، سائل کے کسی خاص مقصد کی غمازی کرتا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہے، اور وہ خاص مقصد یہ ہے کہ جوش صاحب سے ایسی باتیں کہلوائی جائیں جن سے عام مسلمانوں کو صدمہ پہنچے۔ بہرحال سائل کا مقصد پورا ہو گیا کہ مذکورہ سوال، جوش صاحب کے جوابوں کے بغیر بھی صدمہ پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔

سائل کی نیت کا ایک اور سوال سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جوش صاحب نے ''یادوں کی برات'' میں لکھنؤ کے ''جشن تبرا'' میں شرکت کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔ مرتب نے اس کی تفصیلی وضاحت چاہی ہے۔ جوش صاحب کا جواب بخطِ راغب، نقل کفر، کفر نباشد کے مصداق یہاں پیش کیا جاتا ہے: ''حضرت عمرؓ کا کاغذ اور بانس کا پتلا بنا کر اس کی اہانت کرتے تھے اور ایسی نظمیں اور گیت پڑھتے تھے، جن سے اہانت ہو۔'' (صفحہ ۵۳) اس قسم کی باتیں لکھنے کا سوائے اس کے کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں میں نفرت کی دیوار کھڑی کی جائے۔

اب ذرا صوفیاء کرام کے بارے میں بھی سائل کی دیدہ دلیری دیکھ لی جائے۔ سوال کیا جاتے ہے: ''کیا صوفیاء کرام کا وجود ہمارے معاشرے کے لئے جو بیشتر جہلاء اور کم تر علماء اور اہلِ علم سے مرکب ہے، مفید ہے یا یہ حضرات بھی افیون کھلا رہے ہیں۔'' سائل نے صوفیاء کی اکثریت کو جاہل قرار دینے کے بعد اپنے حسب منشا جواب حاصل کر لیا کہ صوفیاء کرام ''افیون کھلا رہے ہیں۔'' (صفحہ ۷۷)

''خطوط جوش'' راغب صاحب کا ایسا علمی کارنامہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ مغلظات اور فحش الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں ملتا ہے، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے۔ اس مجموعے میں جوش کے ایسے خطوط بطور خاص جمع کئے گئے ہیں، جو یقیناً انہوں نے عالمِ سرور میں لکھے ہوں گے کیونکہ کوئی ہوش مند ایسے غلیظ خط نہیں لکھ سکتا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے ان خطوط میں ایسا مواد کثرت سے ملتا ہے جس سے پڑھنے والے کی دل آزاری ہوتی ہے۔ مثلاً اس میں منکر نکیر کو (نعوذ باللہ) نہ صرف ''دو لوفر'' کہا گیا ہے بلکہ ان کے بارے میں مغلظات کا ایسا انبار لگایا گیا ہے جس کی کسی صحیح الدماغ شخص سے لکھنے اور کسی مسلمان سے اسے شائع کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جس پبلشر نے اس کتاب کو شائع کیا ہے اسے ناخواندگی کی وجہ سے علم ہی نہ تھا کہ کتاب میں کیا چھپ گیا ہے۔ لوگوں کے توجہ دلانے پر اس نے نہ صرف یہ کیا کہ کتاب کے ابتدائی چار صفحے حذف کر دیئے تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ کتاب کس نے شائع کی

ہے۔ اب یہ کتاب بازار میں عام طور پر دستیاب نہیں لیکن خاص خاص جگہوں پر فروخت ہوتی ہے۔ اور ایک صاحب تو ایک سو پچیس روپے کی یہ دو سو روپے میں دیتے ہوئے یہ کہہ کر خریدار پر قیمت کے ساتھ احسان کا بوجھ بھی ڈال دیتے ہیں کہ یہی ایک نسخہ میرے پاس تھا جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

کتاب میں سے چار صفحات حذف کئے گئے ہیں، ان میں سے دو کا مشترکہ عکس اس کالم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا ''ثواب'' کس کس کے حصے میں آیا ہے۔

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

سوختنی نہ فروختنی

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بلند پایہ علمی و ادبی کاموں کی وجہ سے ہم ان کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ ان کی ہر بات آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ ثقیل قسم کی علمی تحریریں ہم پڑھتے ہی نہیں، اور اگر بادلِ ناخواستہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے ان کی ثقالت کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے اختلاف رائے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اب کے خلافِ معمول ایسا ہوا کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون آنکھیں کھول کر پڑھ لیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لاہور سے ایک نہایت عمدہ ادبی رسالہ ''علامت'' شائع ہوتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی ہر مہینے ''ادبی زاویے'' کے عنوان کے تحت کسی ادبی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہیں یا کسی ادبی کتاب کا تعارف کراتے ہیں۔ یہ ویسا ہی سلسلۂ مضامین ہے جیسا کسی زمانے میں محمد حسن عسکری رسالہ ''ساقی'' میں ''جھلکیاں'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ''علامت'' کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک امریکن شاعرہ ورجینیا ہیملٹن ایڈائر کے مجموعۂ کلام کا تعارف کرایا ہے، اس شاعرہ کی عمر ۸۳ برس ہے اور یہ اس کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ موصوفہ چھ برس کی عمر سے شاعری کر رہی ہیں۔ شاعری کرتے ہوئے ۷۷ برس گزر چکے تو باسی کڑھی میں ابال آیا یعنی انہیں اپنا مجموعہ شائع کرنے کا خیال آیا۔ اس ضعیفہ کے صبر و ضبط کی داد دیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں یہ عالم ہے کہ شاعر میں ابھی شعر کہنے کا سلیقہ اور شعور بھی پیدا نہیں ہوتا کہ مجموعوں پر مجموعے آنے لگتے ہیں۔ مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کرنے والے نقاد جن میں میرا نام

بھی شامل ہے اور میں بھی اس گناہِ کبیرہ میں شریک ہوں، نئے، خام اور ''بچہ شاعر'' کی شان میں وہ قصیدہ پڑھتے ہیں کہ زمین اور آسمان ایک ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ کام شاعر کو جلد شہرت سے سرفراز کر کے اس کی تخلیقی قوتوں کو یرقان میں مبتلا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جیسے ہمارے حریص زر پرست معاشرے میں لوگ رات بھر میں کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتے ہیں، اسی طرح ہمارے ادیب، شاعر، فنکار محنت، مطالعے اور تربیت کے بغیر، راتوں رات مشہور ہو جانا چاہتے ہیں۔''

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب کے ان ارشاداتِ عالیہ سے اتفاق کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بات یہ کہی ہے کہ جب تک کسی شاعر میں شعر کہنے کا سلیقہ اور شعور پیدا نہ ہو اسے اپنے کلاموں کے مجموعوں کی اشاعت سے گریز کرنا چاہئے یہ شرط نہایت سخت ہی نہیں، نامناسب بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مذکورہ دونوں خصوصیات کسی شاعری میں بوجوہ پیدا نہ ہو سکیں تو اسے تمام عمر اپنی شعری مجموعوں کو محروم اشاعت رکھنا پڑے گا۔ یہ صریحاً ناانصافی ہے۔ اگر اس کڑی شرط پر عمل کیا جائے تو مستقبل میں اردو شاعری کے ننانوے فی صد مجموعے فی بطنِ شاعر ہو کر رہ جائیں گے۔ اور اگر اس شرط کا اطلاق زمانۂ ماضی سے ہوا تو ننانوے فیصد مجموعوں کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ ظاہر ہے اتنی بڑی تعداد میں شعری مجموعے سمندر میں پھینک دیے گئے تو آبی مخلوق کی صحت ہی نہیں، زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ممکن ہے ہمارے استدلال کو کمزور سمجھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہماری گزارشات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں، لہٰذا ہم اس مسئلے پر ایک اور رخ سے روشنی ڈال کر اپنے موقف کی صداقت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعر کہنے کا سلیقہ اور شاعرانہ شعور خداداد صفات ہیں۔ کوئی انسان ان صفات کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا جب تک کہ شعری مجموعے شائع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جو شخص چاہے، اور جب چاہے یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ جن کاموں کو انجام دینے پر انسان قادر نہیں ہے، ان کی خاطر وہ ان کاموں کو بھی انجام دینے سے دستبردار ہو جائے جو اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں یہ تو ویسی ہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص چھلانگ لگا کر قطب مینار کی چوٹی پر نہ چڑھ سکے تو اس پر چھلانگ لگا کر کسی کنوئیں کی تہ تک پہنچنے کی بھی پابندی لگا دی جائے۔ اس طرح تو انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر مجموعۂ کلام چھپوا دیا جائے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو نقاد مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کے خیال سے نوجوان شاعروں کی تعریف کرتے ہیں، وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کا شمار گناہوں میں ہونے لگا ہے۔ اور وہ بھی چھوٹے گناہوں میں نہیں، بڑے گناہوں میں۔ ایک زمانہ تھا کہ بزرگ، نوجوانوں کو پورے پورے دیوان لکھ کر دے دیا کرتے تھے اور احسان نہیں جتاتے تھے اور آج یہ حال ہے کہ آٹھ دس سطروں کے فلیپ اور ڈیڑھ دو صفحوں کے دیباچے لکھنے والے اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے ہیں۔ اگر فلیپ نگاری اور دیباچہ نویسی کو محاورۃً "گناہِ بے لذت" کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ان کاموں کو سنجیدگی سے گناہ کے مترادف سمجھنا ستم ظریفی کی انتہا ہے۔ یہ رویہ ان نقادوں کو مشکل میں ڈال دے گا جن کی فردِ عمل میں فلیپوں، دیباچوں اور تقاریب رونمائی کے لئے لکھے گئے مضامین کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

گزشتہ پچیس برسوں میں اردو میں جو تنقید لکھی گئی ہے، اس کا بڑا حصہ تعریفاتی اور تقریباتی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اگر ان تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو جو کچھ بچے گا، وہ کلیم الدین احمد کے لفظوں میں اقلیدس کے خیالی نقطے یا معشوق کی موہوم کمر کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم فرضی اور خیالی چیزوں پر قناعت کر کے اردو تنقید کے اصل سرمائے کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔

تعریفاتی اور تقریباتی تحریروں کو اگر دائرۂ تنقید سے خارج کر دیا گیا تو اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہمارے بیشتر نقادوں کی گرہ میں صرف وہ قلم رہ جائے گا جو کسی معقول موضوع پر رواں نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ نقاد اکادمی ادبیات کی رائج کردہ اصطلاح کے مطابق "دانشور" بن کر رہ جائیں گے اور وہ بھی واوین میں۔ واضح رہے کہ اس اصطلاح کا اطلاق ان چیزوں پر ہوتا ہے جو سوختنی ہوں نہ کہ فروختنی۔

تعریفاتی اور تقریباتی تنقید لکھنے والوں میں استاد لاغر مراد آبادی سرفہرست ہیں، وہ ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں پر دیباچے اور فلیپ لکھ چکے ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحریروں کو ہم کتابی صورت میں مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اردو تنقید کی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوگی اور اس چراغ سے بے شمار چراغ جلائے جائیں گے۔ ذیل میں استادِ گرامی کے ایک خطبۂ صدارت کا

ابتدائی حصہ بطور نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ کیا جا سکے، ان کے قلم کی موج خرام کیسے کیسے گل کترنے پر قادر ہے۔ مکمل خطبہ ہم آئندہ کسی موقع پر شائع کریں گے۔

"صاحبو! رسمِ دنیا تو یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی اعزاز دیا جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے اعزاز دینے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے، مگر میں اپنی تقریر کا آغاز ایک شکایت سے کر رہا ہوں۔ آج کی تقریب میں مجھے کرسیِ صدارت پر بٹھا کر جو اعزاز بخشا گیا ہے وہ عمر بھر کی رسوائی کے لئے کافی ہے۔ عزیزی شہتیر مراد آبادی کو میں نے بہت سمجھایا کہ تمہارے مجموعۂ کلام میں جو شاعری ملتی ہے، وہ میرے مزاج سے یکسر مختلف ہے۔ اس لئے تم کسی ایسے شخص کو یہ اعزاز بخشو جو پیدائشی طور پر ناموزونیِ طبع کا شکار ہو اور اس وجہ سے نثری نظمیں لکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس عزیز نے جواب دیا، میرا ہر پانچواں مصرع موزوں ہوتا ہے، ان موزوں مصرعوں کی قدر دانی آپ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا، تمہارے جو مصرعے عروضی نقطۂ نظر سے موزوں ہیں، وہ شاعری کے اعتبار سے تمہارے ناموزوں مصرعوں سے بھی خراب ہیں کیونکہ ان میں معنی نہ ہونے کی وجہ سے بے وزنی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ میری ان باتوں پر اس عزیز نے توجہ نہیں دی۔ خاندانی تعلقات کے حوالے سے اپنی خردی اور میری بزرگی کا رقت انگیز نقشہ کھینچا۔ عزیزِ موصوف کے والد مرحوم میرے بچپن کے دوست تھے اور مشاعروں میں میرے مصرعے اٹھایا کرتے تھے۔ میں نے ان جیسا جفاکش انسان نہیں دیکھا۔ ۲۵، ۳۰ برس کی دوستی میں انہوں نے بلا مبالغہ میرے ہزاروں مصرعے اٹھائے ہوں گے۔ چونکہ میرا ہر مصرع وزن میں ہوتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتنا وزن انہوں نے ڈھویا ہوگا۔ افسوس کہ ایسے باوزن شخص کا بیٹا اور بے وزن شاعری کرے! میں نے عزیزی شہتیر مراد آبادی سے کہا، اگر اس کے والد زندہ ہوتے تو اس کا مجموعۂ کلام دیکھ کر اسے عاق کر دیتے کیونکہ وہ اس زمانے کے آدمی تھے جب کہ سمجھا جاتا تھا کہ بے وزن مصرعے کہنے والے کا اخلاق بھی درست نہیں ہوتا۔

اس عزیز نے جب دیکھا کہ میں کسی طرح تقریب کی صدارت کرنے پر راضی نہیں ہوں تو اس نے مجھے وہ کلاشنکوف دکھائی جسے وہ حصولِ مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسی آلۂ تسخیرِ قلوب کے ذریعے اس نے اپنے بروشر کے لئے اشتہارات حاصل کئے ہیں۔ یہ بروشر آج کی تقریب میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس میں شامل درجنوں اشتہارات سے برخوردار خوش اطوار

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کی غیر شاعرانہ سعی و کاوش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھ پیر فرتوت میں اتنی ہمت نہ رہی کہ دوبارہ حرفِ انکار زبان پر لاتا، لہٰذا مجبوراً یہاں موجود ہوں۔

بہر حال اب جب کہ میں یہاں آ ہی گیا ہوں تو صاحبِ تقریب کی تعریف میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ آج کل کے دیباچہ نگاروں اور فلیپ نویسوں سے الفاظ مستعار لیتے ہوئے عرض کروں گا کہ عزیزی شہتیر مراد آبادی کی صورت میں میر تقی میر نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ پچھلے جنم میں میر صاحب سے ضرور کوئی خطا ہوئی ہوگی جس کی یہ سزا انہیں ملی ہے۔ میر اور شہتیر کی شاعری میں مماثلتیں تو بہت ہیں مگر ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ میر صاحب کی طبیعت میں یاس پسندی تھی، اسی لئے وہ اپنے کلام میں روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن عزیزی شہتیر خود نہیں روتے، ان کا قاری روتا ہے۔ قاری کو رونا اس لئے نہیں آتا کہ اس عزیز کے کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام سے استفادہ کرتے ہوئے اردو زبان کی کسمپرسی پر دل دکھتا ہے اور جب دل دکھے گا تو آنکھوں میں آنسو بھی آئیں گے۔ کسی شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے آنسوؤں سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

عزیز موصوف کا ایک قابلِ ذکر وصف یہ بھی ہے کہ کم عمری ہی میں انہیں لفظوں کے استعمال پر وہ قدرت حاصل ہو چکی ہے جو میر صاحب کو ایک عمر کی ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لفظوں کو ان کے معانی سے جدا کر کے استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ کام اس عزیز نے جس مہارت سے انجام دیا ہے، اس کی داد دینے کے لئے بھی ان لفظوں کی ضرورت ہے جو اپنے معانی سے جدا ہو چکے ہوں۔ مگر ایسے لفظ کہاں سے لاؤں.....

سفرنامہ یا معذرت نامہ

جس طرح بعض لوگ ایک موزوں مصرع بھی لکھنے کی توفیق نہیں رکھتے مگر نثری نظموں کے دیوان کے دیوان لکھ ڈالتے ہیں، اسی طرح سفرنامہ عموماً وہ لوگ لکھتے ہیں جو سفر کے دوران آنکھیں بند رکھتے ہیں اور قلم کو فیلِ بے زنجیر کی طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آنکھیں بند رکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سفر کتنا ہی بے مزہ کیوں نہ ہو، سفرنامہ مزے دار بن جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہوں تو آدمی خواب دیکھتا ہے، سفرنامے کو انہیں خوابوں سے سجایا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسودہ جب مطبوعہ صورت میں سامنے آتا ہے تو وہ سفرنامے کی بجائے سفر کی معذرت بن جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان کے کمزور کندھوں پر ایسے ہی سفرناموں یعنی معذرت ناموں کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ شاعر طرح دار و خوش بیان جمیل یوسف نے بھی اردو زبان کے کمزور کندھوں پر اپنے حصے کا بوجھ لاد دیا ہے اور ایک عدد سفرنامہ تصنیف ہی نہیں کیا، زیورِ طبع سے آراستہ بھی کر دیا ہے۔ دنیائے ادب میں آرائش کے لئے اب یہی زیور رہ گیا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لکھنے والے اپنی تحریروں کو علم اور فنی بصیرت سے مزین کیا کرتے تھے۔ اب تو لے دے کے زیورِ طبع ہی عیب پوشی کے کام آتا ہے۔

ہم نے جمیل یوسف کو شاعر طرح دار و خوش بیان کہا ہے۔ ممکن ہے اس پر بعض لوگ اعتراض کریں کہ ہم نے بہت زیادہ تعریف کر دی ہے۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ جس کام کے کرنے میں گرہ سے کچھ نہ جاتا ہو، اس کے کر گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واضح رہے کہ جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے نہیں کرتے، کر کے بھول جاتے ہیں۔ وجہ ظاہر

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد، لیکن ہمارا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ اپنے دعوے کی دلیل میں جمیل یوسف کے چند خوبصورت شعر پیش نہ کر سکیں۔ سنیے اور سر دھنیے (اپنا نہ کہ شاعر یا سنانے والے کا):

دل میں حرص آئی نہیں، لب پر سوال آیا نہیں
مجھ کو دنیا سے غنی ہونے کا کمال آیا نہیں

.....

اس کی سب شوخی رفتار تھی میری خاطر
راہ میں پھر نہ کوئی پھول کھلا میرے بعد

.....

میں سوچتا ہوں سفر کا حساب کیا دوں گا
کہ میرے پاس تو گرد رہ سفر بھی نہیں

.....

ان سرابوں سے کوئی موج رواں بھی ابھرے
خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے

.....

انہی سے پاؤں مرے عمر بھر رہے زخمی
بکھر گئے جو کئی خواب ٹوٹ کر میرے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے عمدہ شعر کہنے والے کو سفرنامہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہمارے خیال میں یہ ایک نامناسب سوال ہے۔ جس طرح ایک ہزار شعروں کے مجموعے سے پانچ شعر کام کے نکل سکتے ہیں، اسی طرح اگر اڑھائی سو صفحوں کے سفرنامے سے اڑھائی جملے بھی کام کے نکل آئیں تو سودا برا نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے جمیل یوسف کے سفرنامے میں اڑھائی سے زیادہ جملے کام کے ہیں۔ خصوصاً وہ جملے جو سہوِ قلم کی وجہ سے لکھنے سے رہ گئے ہوں گے۔ اچھا شعر کہنے والے پر سفرنامہ نہ لکھنے کی پابندی عائد کرنا، ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ اگر جمیل یوسف اچھے شعروں کے خالق نہ ہوتے تو انہیں سفر کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ اور جب سفر کا موقع مل

جائے تو سفرنامہ لکھنے کا موقع کھو دینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جمیل یوسف کی شاعری کے قدردان زیادہ تر ڈنمارک ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان قدردانوں نے انہیں وہاں کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ وہاں جا کر جمیل یوسف نے شاعری سنائی اور بعد ازاں سفرنامہ لکھ دیا۔ پھر اسے کتابی صورت میں محفوظ بھی کر دیا۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے، اسے محفوظ کرنے کا آج کل یہی طریقہ مروج ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں محفوظ ہو کر بھی ضائع ہو جاتی ہیں یعنی ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔

اب جب کہ یہ سفرنامہ "جل پری کے دیس میں" کے نام سے شائع ہو کر ہم تک پہنچ ہی گیا ہے تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا۔ لکھنا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں کہ زندگی اسی میں ضائع کی ہے، مگر کسی کتاب پر لکھنے میں مشکل یہ ہے کہ اسے پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ دو اڑھائی سو صفحوں کی کتاب پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ جناب مصنف کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے اس مشکل کام کو ہمارے لئے خاصا آسان بنا دیا ہے، وہ یوں کہ سفرنامے میں انہوں نے کثرت سے شعر درج کئے ہیں۔ زیادہ تر اپنے اور کم تر دوسروں کے۔ ہم نے شعروں کو چھوڑ کر صرف نثر پڑھنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا تو اڑھائی سو صفحوں میں سے صرف سو صفحے خواندگی کے لائق نکلے ہم نے یہ سو صفحے اتنی ہی دیر میں پڑھ لئے جتنی دیر میں مصنف نے لکھے ہوں گے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ اردو میں ڈنمارک کا پہلا سفرنامہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ اردو کا آخری سفرنامہ بھی ہو، تاکہ جو خوشگوار اثر پڑھنے سے ہمارے ذہن پر ہوا ہے، اسے کوئی اس سے بہتر سفرنامہ زائل نہ کر سکے۔ ہاں اگر یہ اثر خود بخود زائل ہو جائے تو یہ ہماری کوتاہی ہوگی کہ ہم زیادہ دیر تک کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہتے۔ اپنی اس متوقع کوتاہی پر ہم پیشگی معذرت طلب کرتے ہیں۔ جناب مصنف کو معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس مقصد کے لئے سفرنامہ ہی کافی ہے۔

اس سفرنامے میں بے شمار خوبیاں ہیں جو دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آئیں۔ ہم ان خوبیوں کو ایک کاغذ پر نمبروار لکھتے گئے۔ افسوس کہ اب جب کہ ہم کام لکھنے بیٹھے ہیں تو وہ خوبیوں والا کاغذ کہیں گم ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے مطلب یہ نہیں کہ کاغذ کے سفرنامے کی خوبیاں بھی گم ہو گئیں۔ اب قارئین کرام کو خود ہی زحمت کرنی ہوگی کہ سفرنامہ پڑھ کر اس کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہوگا۔ آخر پرانے زمانے میں پانی پینے کے لئے کنواں کھودا ہی جاتا تھا تو یہ کام آج کیوں نہیں ہو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

سکتا۔ بہر حال بے شمار خوبیوں میں سے جو ایک دو خوبیاں ہمیں یاد رہ گئی ہیں، انہیں ہم اپنے کالم میں محفوظ کیے دیتے ہیں۔

اس سفرنامے کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کی طباعت نہایت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جناب مصنف اسے ڈنمارک ہی سے چھپوا کر ساتھ لائے ہوں۔ سفید کاغذ پر سیاہ حروف اس طرح چمکتے ہیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ معاف کیجئے گا یہ تشبیہ کچھ غلط بلکہ الٹ ہو گئی۔ سیاہ رات اور سفید کاغذ میں نیز جگنوؤں میں اور سیاہ حروف میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کتاب میں بعض الفاظ و تراکیب کے املاء میں بھی اسی قسم کی کاریگری سے کام لیا گیا ہے، مثلاً تقریباً ایک درجن مقامات پر "چاق و چوبند" کو "چاک و چوبند" لکھا گیا ہے۔ مصنف کی چاک گریبانی کی رعایت سے یہی املاء درست ہے۔ چاک گریبانی کا قصہ یہ ہے کہ موصوف نے جہاں کہیں بھی ڈنمارک کی خواتین کا ذکر کیا ہے، گریبان کے ساتھ ساتھ اپنا سینہ بھی چاک کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک جگہ یہ واقعہ لکھا ہے: "شام کو مٹر گشت کرتے ہوئے ہم ایک جگہ سر راہ رک کر کوک اور سیون اپ سے تازہ دم ہونے کی کوشش کر رہے تھا کہ ایک چھ فٹ لمبی لڑکی بشرٹ، نیکر اور جوگرز پہنے ہلکے پھلکے ریس کے سائیکل پر سوار ہمارے قریب آ کر رکی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اس نے کوک مانگا۔ اس سے پہلے کہ دکان دار کوک کا ٹن کھول کر اسے پکڑاتا، میں نے وہ ٹن دکان دار سے لے کر اس حسینہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے مجھے تھینک یو کہا اور کوک کا ڈبہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور پھر اس کے ہونٹ ڈبے سے پیوست ہو گئے۔ میں تجریدی آرٹ کے اس زندہ اور متحرک شاہکار کو دیکھتا رہا۔ جس طرح دبلی پتلی اس کی سائیکل تھی، اسی طرح دبلی پتلی وہ خود تھی۔ مجھے کوک اس ٹن پر رشک آتا تھا جو اس کے ہونٹوں سے پیوست تھا، کبھی اس سائیکل پر رشک آتا تھا، جس پر وہ سوار تھی۔"

ہمارا خیال ہے کہ اس حسینہ نے کوک کا ٹن اس خیال سے پھینک دیا ہوگا کہ وہ خالی ہو گیا ہو گا۔ سائیکل بھی اس نے کسی کو بخش دی ہوگی کہ باقی سفر تو اسے ہمارے شاعر کے اعصاب پر طے کرنا تھا۔

اپنی دنیا سنوارنے کے ساتھ ساتھ جناب مصنف نے غالب کی عاقبت خراب کرنے کی

کوشش بھی کی ہے۔ جب موصوف ڈنمارک سے سویڈن گئے تو وہاں انہیں غالب بہت یاد آئے۔ سفرنامے میں پورا ایک باب "مرزا غالب سویڈن میں" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اسٹاک ہوم میں گھومتے ہوئے کئی جگہوں اور موقعوں پر شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ہو نہ ہو، غالب ضرور یہاں آیا تھا اور انہیں جگہوں اور موقعوں پر اس نے اپنے بعض مشہور شعر کہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسے ان اشعار کی تحریک یہیں سے ہوئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیوں کر ہوا کہ اس نے ایسے ایسے شعر کہے جو یہاں آئے بغیر کہے ہی نہ جا سکتے۔ دہلی میں غالب نے ایسے حسین و جمیل پری پیکر کہاں دیکھے ہوں گے جن پر صحیح معنوں میں پریوں کا گمان ہو۔

اس کے بعد غالب کے متعدد ایسے شعر پیش کیے گئے ہیں جو سویڈن کی حسیناؤں کو دیکھ کر لکھے گئے تھے۔ ان شعروں کو اور ان کی تشریح پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب، جمیل یوسف کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں بلکہ جمیل یوسف جیسے کھیل ہی کھیلتے رہے ہیں۔

شعروں اور ڈنمارک کی خواتین کے تذکروں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس سفر نامے میں بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ ڈنمارک میں مصنف کا زیادہ وقت اپنے ہم وطنوں کے درمیان سیخ کباب اور چکن تکے کھانے میں اور مشاعرے پڑھنے میں گزرا، لیکن جو تھوڑا بہت وقت سیر و سیاحت اور وہاں کے باشندوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوا، اس کے بیان نے سفرنامے کو اچھا خاصا خبرنامہ بنا دیا ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ ڈنمارک کے ارباب اختیار نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہمارے ارباب اختیار کی طرح اقتدار کو عیاشی کا وسیلہ نہیں بناتے۔ وہاں ملکی دولت کا بے جا مصرف ناقابل معافی جرم ہے۔ کسی بھی وزیر کو محض اس بنا پر برطرف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سرکاری خرچ پر کسی مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ جمیل یوسف بتاتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنے دور اقتدار میں ڈنمارک گئے تو انہوں نے اپنے ایک سو ساتھیوں کے ساتھ سب سے مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس پر وہاں کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "جس ملک کا اتنا لمبا چوڑا سرکاری وفد اتنے مہنگے ہوٹل کے ایک پورے فلور کو اپنے قیام کے لئے بک کرا سکتا ہے، اس ملک کو بھلا بیرونی امداد کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو بے حد امیر ملک ہے۔ ایسے ملک کو تو ڈنمارک جیسے ملک کو امداد دینی چاہئے۔

پاکستانی شاعر غیر ملکیوں میں جا کر جس طرح در در کی گدائی کرتے ہیں، اس کی عبرت ناک

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

تفصیلات بھی سفرنامے میں ملتی ہیں۔ جمیل یوسف لکھتے ہیں: ''ہمارے ملک کے اکثر ادباء و شعراء چاہے خود کسی کو ساری عمر اپنے گھر کا راستہ تک نہ دکھائیں مگر دوسروں کے ہاں مہمان بننے میں ہمیشہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک سینئر شاعر نے (جو نوجوان نسل کا مقبول ترین شاعر ہے اور اپنے آپ کو پاک و ہند کا نمبر ون شاعر کہتا ہے) تو کمال ہی کر دیا۔ اگست ۹۴ء میں لندن سے اقبال اختر کو پیغام بھجوایا۔ اگر میں کوپن ہیگن کی سیر کو آؤں تو آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟ اقبال اختر نے بے ساختہ کہا، کہ ان سے پوچھیں کہ آپ کو بلا کون رہا ہے؟

اسی طرح ایک پاکستانی ادیب کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے میزبان کے خرچ پر بادہ و ساغر کے شغل کو انتہا تک پہنچا دیا تو ایک ایسی چیز کی فرمائش کی جسے پورا کرنا میزبان کے لئے ممکن نہ تھا۔ حرفِ معذرت سن کر نشے میں دھت مہمان نے میزبان سے کہا: ''اچھا، تو مجھے پیسے دے دیجئے، میں خود ڈھونڈ لاؤں گا۔''

اس قسم کے واقعات پڑھ کر اس سفرنامے کو اگر عبرت نامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سفرنامے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں پاکستان کے نامور ادیب سید ضمیر جعفری کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ جمیل یوسف جس محفل میں ہوں، اپنی شاعری اور خوبصورت فقروں کی وجہ سے جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ زیرِ نظر سفرنامے میں ان کے شعر اور فقرے، مصنف کے شعروں اور فقروں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں گے۔ سفرنامے کے بارے میں جعفری صاحب کی رائے یہ ہے: ''جمیل یوسف کے سفرنامے میں اگر کوئی خوبی نہ ہوتی تو بھی مجھے یہ سفرنامہ اردو کے تمام سفرناموں سے زیادہ پسند آتا کیونکہ اس کے ہر دوسرے صفحے پر میرا ذکر ہے اور اپنے ذکر کو بھلا کون پسند نہیں کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں میرے ذکر کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کتاب کا اسلوبِ بیان اتنا سحر طراز ہے کہ پہلے صفحے ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔''

ہم جعفری صاحب سے اختلاف کی جرأت تو نہیں کر سکتے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جب ڈنمارک میں کوئی ''مطلوبہ چیز'' گرفت میں نہ آئی تو پاکستان آ کر قاری کو گرفت میں لے لیا۔ آہ بے چارہ قاری!

ادیب اور پولیس مقابلہ

۲۵- اکتوبر کے اخبار ''جنگ'' کراچی میں اکادمی ادبیات کی شائع کردہ ''اہلِ قلم کی ڈائریکٹری'' پر ایک نہایت تیز و تند مضمون شائع ہوا ہے جس میں ڈائریکٹری کی غلطیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اکادمی اور اس کے چیئرمین فخرِ زمان کے بارے میں نہایت ناگفتہ بہ قسم کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کہ ہم اپنے قومی اداروں اور قومی شخصیات کے بارے میں کس قدر منفی رویہ رکھتے ہیں، جن غلطیوں، کوتاہیوں اور خوش فعلیوں کو قومی مفاد میں نظر انداز کر دینا چاہئے، انہیں نہ صرف بڑھا چڑھا کر ہم پیش کرتے ہیں بلکہ زبانِ طعن بھی دراز کرتے ہیں۔

اکادمی کے ایک ہمدرد سے ہم نے مذکورہ مضمون کا ذکر کیا تو انہوں نے نہایت حقارت سے فرمایا: ''جو اخبار خبروں سے زیادہ عورتوں کی رنگین تصویریں چھاپ کر اپنی اشاعت بڑھائے، تین مرد تین کہانیاں جیسی لغویات کے ذریعے مقبولیت حاصل کرے اور جس کے ادارتی شذرات، فکاہیہ کالموں کو نعم البدل ہوں، اس کا کسی قومی ادارے کے خلاف کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے چھلنی اپنے بہتر سوچھیدوں کو بھول کر چھاج کے عیبوں کو اچھالے۔'' ہم نے عرض کیا، الزامی جواب سے بات نہیں بنے گی۔ یہ چھلنی اور چھاج کا جھگڑا نہیں ہے۔ نہایت اہم قومی معاملہ ہے۔ اکادمی کی طرف سے ان الزامات کا جواب شائع ہونا چاہئے۔ کہنے لگے۔ اس قسم کے اخباری اور بازاری مضامین کی تردید کے لئے اکادمی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا، اکادمی کے پاس غلطیاں کرنے کے لئے جب بہت سا وقت ہے تو تھوڑا سا وقت غلطیوں کی اصلاح کے لئے بھی نکال لینا چاہئے۔ ہماری بات پر توجہ دیئے بغیر انہوں نے فرمایا، اگر اکادمی سے ایسی ہمدردی ہے تو

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

آپ خود ایک تردیدی مضمون کیوں نہیں لکھ دیتے۔ ہم نے جواب دیا، ہمارا تو کام ہی تردید نگاری ہے۔ جلد ہی آپ کے ارشاد کی تعمیل ارشاد میں ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

"جنگ" میں جو مضمون شائع ہوا ہے، وہ ایک نوجوان ادیب نے لکھا ہے۔ سب سے پہلے ہم اس نوجوان کو سمجھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جوانی لاکھ دیوانی سہی مگر ایسی بھی کیا دیوانگی کہ پولیس مقابلوں کے دور میں کسی سرکاری ادارے یا اس کے سربراہ کو ہدف تنقید بنایا جائے۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے اور اگر کافی نہیں ہے تو نتائج کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔ آپ کا اخبار نہیں ہوگا کیونکہ اخبارات اپنے اہل کاروں کو کسی مشکل کے وقت منجدھار میں اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اخبار کی ذمہ داری تو صرف اتنی ہوگی کہ وہ پولیس مقابلے کی باتصویر خبر چھاپ دے گا اور خبر میں یہ ٹکڑا اپنی طرف سے لگا دے گا کہ ملزم کا ایک ساتھی کلاشنکوف سمیت فرار ہو گیا۔

مذکورہ مضمون میں اہل قلم کی ڈائریکٹری، اکادمی ادبیات اور اس کے چیئرمین فخر زماں پر جو اعتراضات کئے ہیں، ذیل کی سطور میں انہیں رد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اکادمی کے ارباب اختیار سے گزارش ہے کہ اس کے صلے میں ہمیں اگلے سال حسن کارکردگی کا صدارتی اعزاز دلوا دیں، جب لوگوں کو بغیر کسی کارکردگی کے یہ اعزاز مل سکتا ہے تو ہم کارکردگی کے باوجود اس سے محروم کیوں رہیں۔

اہل قلم کی ڈائریکٹری میں پاکستان کے ان تمام زندہ ادیبوں کے کوائف جمع کئے گئے ہیں جو اس وقت مختلف زبانوں میں ادب تخلیق کر رہے ہوں۔ مضمون نگار نے اعتراض کیا ہے کہ ان زندہ ادیبوں میں ۳۷ ادیب ایسے بھی شامل ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے اور درجنوں ایسے ادیبوں کے کوائف ڈائریکٹری میں شامل نہیں ہیں جن کا ابھی انتقال نہیں ہوا۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ جب اکادمی ادبیات کو یہی معلوم نہیں کہ پاکستان میں کون ادیب زندہ ہے اور کون مر چکا ہے تو یہ ادارہ ادیبوں کے مسائل کیسے حل کرے گا۔ جناب معترض کی خدمت میں عرض ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، اکادمی ادبیات کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ ۳۷ ادیب اگر مر گئے اور درجنوں نہیں مرے تو اس کی ذمہ دار اکادمی نہیں ہے۔ مرنے والوں کے غم میں اور نہ مرنے والوں کے انتظار میں ڈائریکٹری کی اشاعت کو تو ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رہی ادیبوں کے مسائل حل کرنے کی بات تو جو مر گئے، ان کے سارے مسئلے خود بخود بھی کسی نہ کسی دن حل ہو

جائیں گے۔ موت تو بہر حال آنی ہی آنی ہے۔ اس سے کوئی انسان نہیں بچ سکتا۔ باقی ماندہ ادیبوں نے آب حیات نہیں پی رکھا کہ ان کے مسائل ان کی زندگی میں حل کئے جائیں۔ اگر بفرض محال کسی نے آب حیات کے دو چار گھونٹ چڑھا ہی لئے ہوں، تو پھر اس کے مسائل حل کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ تو خود معاشرے کے لئے ایک لاینحل مسئلہ بن چکا ہوگا۔

مضمون نگار نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ ڈائریکٹری میں بعض ادیبوں کے کوائف دو دو مرتبہ درج کئے گئے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں ڈاکٹر انور سجاد کا نام بھی شامل ہے۔ ہمیں اس پر حیرت ہے کہ ڈاکٹر انور سجاد کے کوائف صرف دو مرتبہ درج کئے گئے ہیں حالانکہ مزاحمتی ادیب ہونے کی وجہ سے وہ اس لائق تھے کہ ڈائریکٹری کے ہر صفحے پر ان کے کوائف درج کئے جاتے۔ مزاحمتی ادیب اپنی تحریروں کی وجہ سے نہیں، کوائف ہی کی بنا پر ادیب کہلاتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں نہ سہی، ادیبوں کی ڈائریکٹری میں تو ان کا ذکر بار بار آنا چاہئے تاکہ وہ ادیب عبرت حاصل کر سکیں جو مزاحمتی ادب نہیں لکھتے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ مشہور شاعر رعنا اکبر آبادی کو ڈائریکٹری میں زندہ دکھایا گیا ہے، جب کہ ان کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا ہے نیز ان کی تصانیف میں "ذکر و فکر" کو شامل کیا گیا ہے جو ان کی نہیں، ان کے داماد صبا اکبر آبادی کی تصنیف ہے۔ ہمیں یہ اعتراض پڑھ کر ہنسی آئی کہ جناب معترض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ رعنا اکبر آبادی زندہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، اردو کے زندۂ جاوید شاعر تو ہیں۔ زندہ کے مقابلے پر زندۂ جاوید کا ڈائریکٹری پر زیادہ حق ہے۔ اگر ان کے داماد کی تصنیف ان کے نام سے درج کی گئی ہے تو یہ بھی کوئی غلط بات نہیں۔ گھر کی چیز گھر ہی میں رہی، کہیں باہر تو نہیں گئی۔

ایک دلچسپ اعتراض یہ ہے کہ ڈائریکٹری میں کراچی کے مشہور ترقی پسند نقاد عتیق احمد کا نام عقیق احمد لکھا گیا ہے۔ معترض کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ غلطی نہیں، غلطی کی تصحیح ہے۔ لفظ "عتیق" کے کئی معنوں میں سے ایک معنی پرانے اور کہنہ کے بھی ہیں۔ اکادمی والوں نے سوچا ہوگا کہ کسی ترقی پسند کا نام "عتیق" نہیں ہو سکتا کہ اسے پرانے اور کہنگی سے کیا واسطہ؟ "عقیق" ایک بیش قیمت سرخ پتھر کو کہتے ہیں۔ ترقی پسندی کو سرخ رنگت سے جو مناسبت ہے، اس کا خیال کرتے ہوئے پروفیسر صاحب "عقیق" کہلانے ہی کے مستحق ہیں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ڈائریکٹری کی قیمت تین سو روپے ہے۔ یہ اتنی زیادہ ہے کہ عام آدمی ڈائریکٹری نہیں خرید سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا عام آدمی ہے جو اس طومار اغلاط کو خریدنے کا خواہاں ہوگا۔ یہ ڈائریکٹری تو ان خاص الخاص لوگوں کے کام کی چیز ہے جنہیں کتابوں سے عشق ہوتا ہے اور غالب یہ بتا ہی چکے ہیں: کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ گویا کسی کے دماغ میں خلل ہو تو وہ اس ڈائریکٹری کو خریدے گا۔ ڈائریکٹری میں کیڑے نکالنے کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں: ''ہمارے ہاں احتسابی عمل کی روایت نہ ہونے کے سبب سرکاری ادارے مشینی انداز میں کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ڈائریکٹری کی تیاری میں کثیر سرمایہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ ملکی دولت کے غلط استعمال پر کسی قسم کی کارروائی کیوں نہیں کی جاتی؟''

مضمون نگار قومی سرمائے کے ضیاع پر یوں چراغ پا ہیں، جیسے یہ رقم ان کی گرہ سے جاتی رہی ہو۔ جس ملک میں لوگ اربوں روپے قرض لے کر واپس نہ کرتے ہوں، وہاں اگر دو چار کروڑ روپے اکادمی کے پرنالے سے بہہ جائیں تو اس پر افسوس نہیں کرنا چاہئے بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ اتنے بڑے پرنالے سے اتنی کم رقم خارج ہوئی۔ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ ملکی دولت کے غلط استعمال پر کوئی کارروائی کیوں نہیں کی جاتی، ان کی سادگی اور معصومیت کی دلیل ہے۔ ہمارے ملک میں ملکی دولت ضائع کرنے کے خلاف کارروائی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مزید ملکی دولت ضائع کی جائے۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی تجویز ملکی مفاد میں نہیں ہے، لہٰذا جو دولت ضائع ہو گئی، اس کا غم نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی دولت آنی جانی چیز ہے اور اکادمی ادبیات کے سربراہ اسے ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ ایسے بے نیاز شخص پر الزام تراشی مناسب نہیں۔

جناب معترض نے اکادمی کو مطعون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بلکہ بعض جگہ تو بے موقع بھی اس بے چاری کی کردار کشی کی ہے۔ ایک جگہ ڈائریکٹری کی اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''فخر زماں اس کے دعوے دار ہیں کہ بین الاقوامی کانفرنس سے پاکستان کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ ادھر یہ بھی سنا ہے کہ اس کانفرنس کے بہت سے بلوں کی ادائیگی اب تک نہیں کی گئی۔ اکادمی ادبیات کے کراچی میں قائم دفتر کا ٹیلی فون اکثر بل کی عدم ادائیگی کا شکار رہتا ہے۔

اسے کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ملک کی عزت اور وقار کا ٹیلی فون کی ادائیگی سے

کیا تعلق؟ حیرت کی بات ہے کہ جناب معترض ایک طرف اکادمی کو فضول خرچی کا الزام دیتے ہیں اور دوسری طرف ٹیلی فون وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی نہ کرنے پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ بلوں وغیرہ کی ادائیگی نہ کر کے اکادمی نے کفایت شعاری کا مظاہرہ کیا ہے جس کی تعریف کی جانی چاہئے۔ ہم نے یہ باتیں اعتراض کے طور پر نہیں لکھیں، اکادمی کو داد دینے کے لئے لکھی ہیں.....

مضمون نگار نے جب اکادمی اور اس کی ڈائریکٹری کو اچھی طرح کوس لیا تو پھر اکادمی کے چیئرمین کی طرف توجہ کی۔ ان کے بارے میں پہلے تو اردو کے بزرگ ادیب شوکت صدیقی کا یہ قول پیش کیا: ''اپنے اعزاز میں تقریبات میں شریک ہونا فخر زمان کا سب سے بڑا کام ہے اور ان کی تقاریر ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات میں باقاعدگی سے آتی ہیں۔ گویا ٹیلی ویژن پر جلوہ دکھانا، ریڈیو پر آواز سنانا اور اخبارات میں تصویر چھپوانا ہی ان کا مقصد ہے۔'' شوکت صدیقی کے اس قول پر جو قول محال معلوم ہوتا ہے، مضمون نگار نے یہ اضافہ کیا ہے۔ ''فخر زمان نے ایک کام اور بھی کیا ہے کہ اپنی کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم کرائے ہیں۔''

ہم نہایت ادب کے ساتھ شوکت صدیقی صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے، آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ سر آنکھوں پر لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ فخر زمان نے جو اچھے کام کئے ہیں، ان کی داد بھی انہیں ملنی چاہئے۔ دوسروں کے اعزاز میں تقریبیں منعقد کرانا، خود آگاہی اور خود شناسی کے مراحل طے کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح انسان کو موقع ملتا ہے وہ دوسروں کی نظروں سے اپنے آپ کو دیکھ سکے۔ فخر زمان نے ایک نئے اسلوب کی بنا رکھی ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ہمارے نزدیک اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ موصوف ٹی وی پر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں اور اخبارات میں اپنی تصویریں چھپواتے ہیں۔ صورت اچھی ہو تو اس قسم کے اشغال مستحسن ہوتے ہیں نہ کہ مذموم۔ آخر ٹی وی اور اخبارات میں اشتہار بھی تو ہوتے ہیں، ان پر تو کوئی معترض نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے ادبی ہیرو کی جلوہ نمائی پر کوئی اعتراض کیوں؟

اگر فخر زمان نے اپنی کتابوں کے دوسری زبانوں میں ترجمے کرائے ہیں تو یہ بھی کوئی غلط کام نہیں ہے۔ جن زبانوں میں تراجم کرائے گئے، جب ان زبانوں کے بولنے والوں کو کوئی

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اعتراض نہیں ہے تو ہما شما کو اس خالص ادبی و علمی معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ فخرِ زماں پنجابی کے فخرِ زباں یعنی ادیب شہیر ہیں۔ نوبل پرائز کے لئے پنجابی زبان کی کتابیں آتیں۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ فخرِ زماں کی کتابوں کا انگریزی اور بعض دوسری بڑی زبانوں میں منتقل کیا جاتا۔ اب ان کتابوں پر نوبل پرائز ملنے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت دو چار سال اور چل گئی تو ادب کا نوبل پرائز فخرِ زماں کو، امن کا جے سالک کو اور سائنس کا مشہور شاعر ظفر اقبال کو مل جائے گا۔ ظفر اقبال اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر ہیں اور بر بنائے عہدہ سائنس کا نوبل پرائز حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔

لوحِ ادب پر حرفِ مکرّر

اظہر جاوید کا ماہنامہ "تخلیق" اردو کا ایک مقبول ادبی رسالہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسے لکھنے والوں سے زیادہ لکھنے والیوں کا تعاون حاصل ہے۔ جتنی خواتین اس رسالے میں نظمیں، غزلیں، افسانے اور سفرنامے لکھتی ہیں، اتنی تو دوسرے رسالوں کو پڑھنے والیاں میسر نہیں ہیں۔ رسالہ "عصمت" کے بعد "تخلیق" نے خواتین میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

آج کل اس رسالے میں بشریٰ اعجاز سفرنامۂ ہندوستان لکھ رہی ہیں جو "آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں" کے عنوان سے بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ موصوفہ شاعرہ ہیں اور مشاعروں میں شرکت کے لئے ہندوستان تشریف لے گئی تھیں۔ ہندوستان میں ان کا قیام چند روز رہا مگر سفرنامہ طوالت میں قیام کی مدت سے آگے نکل گیا ہے۔ آٹھ قسطیں چھپ چکی ہیں، اور آثار یہ کہہ رہے ہیں کہ تین چوتھائی سفر کا تذکرہ باقی ہے۔ لیکن سفرنامے کی طوالت پڑھنے والے پر گراں نہیں گزرتی کہ واقعاتِ سفر بھی دلچسپ ہیں اور لکھنے والی کا اندازِ بیان بھی۔ ہم نے بشریٰ اعجاز کی شاعری نہیں پڑھی، تاہم ان کی نثر ان کے شاعر ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ خدا کرے یہ جھوٹی گواہی نہ ہو۔ اگرچہ جھوٹی گواہی دینا دیباچہ نگاروں اور تقریباتی نقادوں کا کام ہے مگر کبھی کبھی عام ادیب بھی یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر دیتے ہیں۔

سفرنامے کی تازہ ترین قسط میں بشریٰ اعجاز نے مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی سے اپنی ایک ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اس ملاقات میں کیفی صاحب نے ایک دردناک واقعہ بیان کیا ہے۔ چند سال قبل وہ پاکستان تشریف لائے۔ جس گھر میں ان کا قیام تھا، وہاں کسی کا فون آیا۔ فون

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کرنے والے اور سننے والے کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

"سنا ہے یہاں شبانہ اعظمی آئی ہوئی ہیں؟"

"جی نہیں۔ شبانہ تو نہیں، ان کے والد کیفی اعظمی صاحب آئے ہیں۔"

"اوہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ شبانہ آرہی ہیں۔" (بقول کیفی اعظمی یہ بات کہنے والے کی آواز میں مایوسی تھی)

"آپ کو ان سے کچھ کام تھا؟"

"کام تو نہیں، ان سے ملنے کا شوق تھا۔"

"دیکھئے، اگر کیفی صاحب سے ملنا ہے تو گھر تشریف لائیے۔"

"جی نہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔ اس طرح کے لوگ تو یہاں اکثر آتے ہی رہتے ہیں۔ البتہ شبانہ ہوتیں تو پھر بات تھی۔"

یہ واقعہ سنا کر کیفی صاحب نے فون کرنے والے کے لہجے سے بھی زیادہ مایوسانہ لہجے میں کہا: "یہ ہے اس معاشرے میں ادیب کا اصل مقام۔ ایسے موقعوں پر لگتا ہے جیسے تمام عمر جھک مارتے گزار دی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ابن الوقت بن کر ٹھاٹ کی زندگی گزارتے اور شان سے مر جاتے۔ کم از کم متعلقین کو تو ہم سے گلہ نہ ہوتا۔"

ہمیں کیفی صاحب سے دلی ہمدردی ہے کہ انہوں نے زندگی بھر شاعری کی مگر شاعری ان کی شناخت نہ بن سکی۔ وہ کسی اور حوالے سے پہچانے جاتے ہیں، لیکن وہ اس صورت حال سے پریشان نہیں ہیں۔ بشریٰ اعجاز کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: "کبھی کبھی ہمارے حوالے بے نام ہونے لگتے ہیں، تو وقتی طور پر بددلی سی ہوتی ہے ورنہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ نظریات کی جنگ لڑنا کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ جو اس راہ کے مسافر ہوتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ کانٹوں بھرا راستہ ہے جس پر تمام عمر ننگے پیر چلنا ہے۔"

جناب کیفی کا حوصلہ قابل داد ہے مگر استاد لاغر مراد آبادی کی سنگ دلی دیکھئے کہ انہوں نے فرمودۂ کیفی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: "آپ نے نظریات کی بے مقصد جنگ لڑی ہی کیوں؟ اس قسم کی جنگ میں تو روس جیسی سپر پاور بھی شکست کھا گئی۔ اگر جنگ و جدل کی بجائے آپ

شاعری کرتے تو آج شاعری ہی آپ کی شناخت ہوتی اور یہ شکایت نہ ہوتی کہ آپ کو شبانہ کے حوالے سے پہچانا جاتا بلکہ شبانہ آپ کے حوالے سے پہچانی جاتی۔ اس طرح آپ کو کانٹوں بھرے راستے پر جوتے پہنے بغیر چلنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔"

ہم اس پر حیران تھے کہ ایک خالص ادبی معاملے میں استاد گرامی نے روس کو کیوں گھسیٹ لیا کہ اتفاقاً کیفی صاحب کا ایک انٹرویو روزنامہ "جنگ" کی ایک حالیہ اشاعت میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ سوویت یونین کا خاتمہ اشتراکی نظریے کا خاتمہ نہیں ہے۔ انہوں نے یہ مژدہ سنایا ہے: "اشتراکی فکر کو ترک نہیں کیا گیا۔ امریکہ اور مغربی طاقتیں کامیاب ضرور ہوئی ہیں لیکن اشتراکی فکر کو جدید تقاضوں کے مطابق اختیار کیا جا رہا ہے..... دنیا میں اشتراکی نظام کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے قبول کیا جا رہا ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک اس صورت حال سے سخت پریشان ہیں۔"

اس صورت حال سے ہم نیاز مندانِ کیفی بھی پریشان ہیں کہ جیسی نظریاتی شاعری وہ اب تک کرتے رہے ہیں، ویسی ہی آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ محض اس خوش فہمی پر کہ اشتراکی نظام کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے قبول کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ہمیں محمد حسن عسکری یاد آرہے ہیں، جنہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اتنی تیزی سے تو روس میں انقلاب بھی نہیں آیا، جتنی تیزی سے ہمارے شاعروں نے اس انقلاب کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں۔

"جنگ" والے انٹرویو میں کیفی صاحب نے اور بھی کئی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں فرماتے ہیں: "جن دنوں ترقی پسند تحریک کو مقبولیت حاصل تھی تو اس سے وابستگی کے دعوے دار کون اور کتنے لوگ تھے۔ جب وقت بدلا تو یہ لوگ کہاں چلے گئے۔ جو لوگ ماضی میں اپنے نظریے سے سچے تھے، وہ آج کل بھی اس کے حامی ہیں، ترقی پسند ادب کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے، آپ اسے ترقی پسند ادب قرار نہیں دے سکتے۔"

کیفی صاحب کے اس غم میں ہم برابر شریک ہیں کہ ترقی پسندی کے نام پر جو کچھ لکھا گیا، وہ لوحِ ادب پہ حرفِ مکرر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند بھی بدل گئے۔ تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ کم از کم ایک شخص ایسا ہمارے درمیان موجود ہے جو اتنے انقلابوں کے باوجود بھی نہیں بدلا۔ کیفی صاحب کو خدا سلامت رکھے کہ ترقی پسندی کے مزار

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کے مجاور اب صرف وہی رہ گئے ہیں۔ وفاداری بشرطِ استواری اسی کو کہتے ہیں۔

کیفی صاحب مشاعروں اور مشاعرہ باز شاعروں سے بھی خوش نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

''مشاعروں سے زبان و ادب کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ البتہ شعراء کو ضرور فائدہ ہوا ہے۔ مشاعرے پرفارمنگ آرٹسٹ بن گئے ہیں۔ میں ایسے شعراء سے واقف ہوں جو مشاعروں کی وجہ سے صاحبِ حیثیت بن گئے۔ ان کی شاعری کاغذ پر بے معنی لگتی ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک مصرع بھی موزوں نہیں کر سکتے لیکن مشاعروں میں اپنی گائیکی اور ہنرمندی سے نہایت کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔''

ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ زبان و ادب کو فائدہ تو مشاعروں سے باہر بھی نہیں پہنچ رہا، کیونکہ مشاعروں کے اندر اور باہر ایک ہی جیسے لوگ سرگرمِ عمل ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اندر والے مصرع موزوں نہیں کر سکتے، باہر والے کر لیتے ہیں۔ لیکن مصرع موزوں کر لینا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ اگر مصرع موزوں کر لینے سے آدمی شاعر بن جاتا تو راغب مراد آبادی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ وہ ہر موقع کی مناسبت سے مصرع ہی نہیں پوری رباعی موزوں کر لیتے ہیں۔ یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ انھوں نے آج تک ایک بھی ایسا مصرع موزوں نہیں کیا، جس پر شاعری کا شبہ کیا جا سکے۔ گویا موصوف کو شبے کا فائدہ بھی نہیں ملا۔

کیفی صاحب نے مذکورہ انٹرویو میں انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ''انسان'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی عنوان سے جمیل الدین عالی بھی گزشتہ ۳۶ برسوں سے ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ وہ اب تک بارہ ہزار مصرعے لکھ چکے ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ عالی صاحب کے تازہ مجموعہ کلام ''اے مرے دشتِ سخن'' میں بھی اس کے چار ابواب شامل ہیں۔ ہمیں امید ہے، جمیل الدین عالی کی طرح کیفی صاحب اپنی طویل نظم کے لکھنے میں ۳۶ برس صرف نہیں کریں گے۔ لیکن اس میں شبہ ہے کہ اردو زبان ایک ہی موضوع پر دو طویل نظموں کی متحمل ہو سکے۔ اس لئے ہماری تجویز ہے کہ عالی صاحب اپنے بارہ ہزار مصرعے کیفی صاحب کی خدمت میں تحفۃً پیش کر دیں اور کیفی صاحب نظم کو مکمل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ اس طرح عالی صاحب کو نظم مکمل کرنے کی اور کیفی صاحب کو از اول تا آخر لکھنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ رہی وہ زحمت جو پڑھنے والے اٹھائیں گے تو اس کے لئے

دونوں شاعروں کی طرف سے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ چونکہ یہ نظم ہماری تجویز کے مطابق مکمل ہوگی، اس لئے معافی بھی ہمیں کو طلب کرنی چاہئے۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ شعراء کرام شعر بھی کہیں اور عذرِ گناہ بھی پیش کریں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نقاد یا اشاریہ ساز

شہزاد منظر کی خوش قسمتی میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابیں کثرت سے چھپتی رہتی ہیں، بدقسمت تو وہ قارئین ہیں جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوتے، ڈرتے ہیں کہ کہیں ڈوب نہ جائیں۔ ان بے حوصلہ اور کم ہمت قارئین کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ پایاب دریاؤں میں ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔

پچھلے دنوں شہزاد منظر کی ایک نہ دو، اکٹھی تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ دو انہوں نے خود لکھی ہیں اور تیسری ان کی تصنیف تو نہیں، لیکن ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں دوسروں نے اسی طرح چندہ کر کے لکھی ہے، جس طرح چندے سے رفاہی و فلاحی کام انجام دیئے جاتے ہیں، لہٰذا اس کتاب کو بھی انہیں کی ملکیت سمجھنا چاہئے، انہوں نے خود جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کا نام ہے "مشرق و مغرب کے چند مشہور ادباء" اس میں پندرہ مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ سولھویں کا تذکرہ کتاب میں اس لئے شامل نہیں کہ اس کے لئے ایک علیحدہ کتاب مرتب کی گئی ہے جس کا ذکر کچھ اوپر آ چکا ہے اور باقی آگے آئے گا۔

شہزاد منظر کی دوسری تصنیف "پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال" ہے۔ یہ اپنے موضوع پر فکر انگیز اور دلچسپ کتاب ہے۔ فکر انگیز اتنی کہ معاملہ فکر و تشویش تک جا پہنچتا ہے اور دلچسپ ایسی کہ ایک مرتبہ ہاتھ میں آ جائے تو ہاتھ سے چھوٹتی نہیں، البتہ صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے بار بار چھوٹ جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل پھر کبھی سہی۔ فی الحال ہم شخصیت و فن والی کتاب کے ذکر سے اپنے کالم کو بامعنی بنانے کی کوشش کریں گے۔

یہ بات تو کتاب کے نام ہی سے ثابت ہے کہ شہزاد منظر کے پاس فن بھی ہے اور شخصیت

بھی۔ اس کے بعد کتاب کے صفحات خالی بھی ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا، لیکن فاضل مرتبین نے اپنے دعوے کو بے دلیل نہیں رہنے دیا، انہوں نے کتاب کے دو سو سے زیادہ صفحات میں تقریباً چار درجن ادیبوں کی تحریریں پیش کی ہیں، جن سے موضوع کی شخصیت اور فن پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نظیر صدیقی سے لے کر خود شہزاد منظر تک موجودہ دور کا شاید ہی کوئی ادیب ہوگا جس نے شہزاد منظر کو خراج عقیدت پیش نہ کیا ہو، صرف دو ادیب ایسے ہیں جنہوں نے بخل سے کام لیا ہے، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

کتاب میں سب سے پہلا مضمون خود شہزاد منظر کا ہے جس میں انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی روداد سنائی ہے، انہوں نے اپنا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کے جد امجد بہت بڑے صنعت کار تھے، لیکن ان کی اولادوں نے اپنی تمام دولت عیش و عشرت یعنی گھڑ دوڑ اور قمار بازی میں لٹا دی، شہزاد منظر کو دنیاوی دولت تو نہ ملی، لیکن خدا نے انہیں دولتِ علم سے نوازا، البتہ گھڑ دوڑ کا شوق انہیں بھی ہے، یعنی وہ تنقید نگار ہیں، میدانِ ادب میں اردو کا ہر تنقید نگار اپنے گھوڑے کو دوسروں کے گھوڑوں سے آگے لے جانے کی فکر میں رہتا ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون علی حیدر ملک کا ہے جو نہایت عمدہ شخصی خاکہ ہے اور جسے پڑھ کر کچھ اس قسم کا تاثر ابھرتا ہے کہ شہزاد منظر بڑی پرکشش اور پہلو دار شخصیت رکھتے ہیں، انہیں دیکھ کر پرانے زمانے کے ان بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی ہو جاتی ہے جو اگر اپنے زمانے سے بھی زیادہ پرانے زمانے میں ہوتے تو ان کی مناسب قدر اور دیکھ بھال ہوتی۔ علی حیدر ملک لکھتے ہیں۔ "اس کی خوبی یا خرابی یہی ہے کہ وہ ہر آدمی سے اپنے تعلقات کی بنیاد خلوص اور بے غرضی پر رکھتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ اکثر صورتوں میں غلط نکلتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ ہمیشہ اس کا استحصال کرنا اور اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر کامیاب نہ ہوں تو اسے برا بھلا کہنے لگتے ہیں جس کی انتہا دشنام طرازی اور بہتان تراشی پر ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ جانتا، سب کچھ سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود جوابی کارروائی نہیں کرتا، سب کے ساتھ اسی خلوص اور شرافت کو اس کی کمزوری اور بے وقوفی پر محمول کرتے ہیں۔"

افسوس کیسا خراب زمانہ آ گیا ہے کہ جن تعلقات کی بنیاد خلوص اور بے غرضی پر ہو ان کا نتیجہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

دشنام طرازی اور بہتان تراشی کی صورت میں سامنے آئے اور خلوص و شرافت کو کمزوری اور بے وقوفی سمجھا جائے۔ ایک سینئر ادیب کے حوالے سے اس قسم کے رویے کو سوائے بے ادبی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ تو سنا تھا کہ بعض ادیبوں کی تحریروں کی قدر نہیں ہوتی لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کا خلوص بھی متاع کاسد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس قسم کے عجائبات دیکھ کر ان لوگوں پر رشک آتا ہے، جو ادب کا روگ نہیں پالتے۔

اوپر کی سطور میں ہم نے جن دو ادیبوں کے تخیل دو مدح ہونے کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ایک انتظار حسین ہیں اور دوسرے مظفر علی سید۔ انتظار حسین چونکہ نہایت مہذب اور شائستہ انسان ہیں اس لئے وہ علامتوں او استعاروں کے ذریعے بات کرتے ہیں تا کہ سمجھنے والوں تک ان کی بات پہنچ جائے اور نہ سمجھنے والے بھی خوش ہوں کہ کیسی عمدہ بات کہی ہے۔ انہوں نے شہزاد منظر کی کتاب "جدید اردو افسانہ" پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا "آج کے افسانے کے حساب سے ہمیں ایک نئے وقار عظیم کی کس قدر ضرورت تھی۔ افسانے کی نئی کروٹ کے ساتھ کتنے سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو جواب مانگتے ہیں، اس کام کے لئے کسی ایسے نقاد کی ضرورت تھی جو پتا مار کر بیٹھے، نئے فقروں اور اصطلاحوں کی تشریح کرے اور افسانے کی نئے سرے سے تعریف طے کرے۔ اس کام میں تھوڑی موری بھی ہوتی ہے مگر ہوتا ہے یہ کام بہت ضروری۔ شہزاد منظر نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔"

شہزاد منظر کو نیا وقار عظیم کہنا ویسا ہی ہے جیسے کوئی ظفر اقبال کو نیا غالب کہنے کے بجائے نیا ہر گوپال تفتہ کہہ دے، یہ بات نظیر صدیقی کے سر سے گزر گئی اور انہوں نے گفتۂ انتظار حسین پر ان الفاظ میں حیرت کا اظہار کیا "اردو افسانے کے پہلے نقاد کی حیثیت سے پروفیسر عظیم کی اہمیت مسلم ہے لیکن یہ بات خود ان کی زندگی میں محسوس کی جانے لگی تھی کہ جدید اردو افسانے کی تنقید کسی وقار عظیم کی بجائے کسی حسن عسکری، کسی ممتاز شیریں، کسی احسن فاروقی، کسی عزیز احمد۔ یہاں تک کہ خود کسی انتظار حسین کی محتاج اور متقاضی تھی، لہٰذا انتظار حسین کا یہ کہنا میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آج کے افسانے کے حساب سے ہمیں ایک نئے وقار عظیم کی ضرورت ہے۔"

ہمارے پیشہ ور نقاد عموماً انہیں موضوعات پر لکھتے ہیں جو ان کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں لیکن مظفر علی سید معاملے کی تہہ تک پہنچ کر لکھتے ہیں، انہوں نے انتظار حسین کے قول فیصل کی شرح ان

الفاظ میں کی: "شہزاد منظر خود بھی افسانہ نگار ہیں اور کبھی کبھی جائزہ نما تنقیدی مقالات لکھتے رہتے ہیں، ان کو انتظار حسین نے ایک نیا وقار عظیم اور نئے افسانے کے ایک بھلے مانس نقاد کا لقب دیا ہے، نیا وقار عظیم کہنے کی معنویت اتنی بلیغ ہے کہ شاید بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے اور نقاد اگر بھلا مانس ہو تو تنقید کی جگہ بھی بھلمنساہت ہی سے کام لے گا۔ چنانچہ اس کتاب کے مندرجات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف محترم کوئی ناگوار سچ بول کر کسی فرد واحد کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے، وہ کہتے تو ہیں کہ فہرست بنانا ان کا کام نہیں مگر اس کے باوجود کم سے کم پانچ سات جگہوں پر انہوں نے پرانے اور نئے افسانہ نگاروں اور پھر قابل ذکر افسانوں کے ساتھ ساتھ آٹھ سطری فہرستیں ضرور بنائی ہیں اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور کچھ اسی طرح کی ہیں مگر وہ اس وقت یاد نہیں آ رہیں۔ گویا یادداشت بہتر ہوتی اور سارا انبار سامنے ہوتا تو شاید پوری کتاب نئے افسانے اور نئے افسانہ نگاروں کا اشاریہ بن کر رہ جاتی۔"

انتظار حسین نے تو کسی حد تک شہزاد منظر کو نقاد تسلیم کیا تھا، لیکن سید صاحب نے اچھے خاصے نقاد کو اشاریہ ساز بنا دیا، شہزاد منظر پر ان باتوں کا کوئی اچھا اثر نہیں ہوا اور انہوں نے سید صاحب کا قرض مع سود کے چکا دیا۔ زیر نظر کتاب کے آخر میں شہزاد منظر کے تین انٹرویو بھی شامل ہیں، ان میں سے ایک میں وہ فرماتے ہیں۔ "جہاں تک مظفر علی سید کا تعلق ہے، وہ شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی اور اب کالم نویس بھی ہیں۔ وہ اردو کے واحد شاعر اور نقاد ہیں جو نصف صدی سے زیادہ عرصے سے لکھنے کے باوجود صرف ایک کتاب کے مصنف ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور بلاشبہ اردو کے تنقیدی ادب میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ وہ فکشن پر محض منہ کا مزہ بدلنے کے لئے لکھتے ہیں۔ وہ مخصوص تعصبات کے مالک ہیں۔ یہ تعصب ادبی بھی ہے اور سیاسی بھی، نسلی بھی اور علاقائی بھی۔ وہ ادب میں معروضیت کے دعوے کے باوجود دوست نوازی کے قائل ہیں۔ اس لئے اپنے حلقہ بگوشوں کو خاص طور پر اچھالتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی اوسط درجے کا لکھنے والا کیوں نہ ہو۔"

جناب شہزاد نے جو الزامات عائد کئے ہیں، ان کا جواب ملزم کو خود دینا چاہئے، ہم تو معترض کو حق گوئی کی داد ہی دیں گے کہ انہوں نے پہلے تو یہ طعنہ دیا ہے کہ نصف صدی کی تگ و دو کے بعد سید صاحب صرف ایک کتاب کے مصنف بن سکے اور پھر یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں غیر معمولی اضافہ ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ کچھ لوگ کتابوں

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں اور کچھ ادب کے معیار میں۔ ہماری دعا ہے کہ فریقین اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ہمارا بھی ایک کالم شامل ہے، جو کئی برس پہلے لکھا گیا تھا، ہمیں حیرت ہوئی اور خوشی بھی کہ کئی برس پہلے بھی شہزاد منظر کے بارے میں ہماری رائے بہت اچھی تھی۔ اس کالم کی ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں۔ ''شہزاد منظر نیک اور سیدھے آدمی ہیں، اتنے نیک اور سیدھے کہ کبھی کبھی تو انہیں افسانہ نگار اور نقاد ماننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ موصوف اردو ادب کی تاریخ میں اپنی تحریروں کی وجہ سے نہیں، نیکیوں اور سیدھے پن کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ شہزاد منظر کی نیکی یہ ہے کہ مسلسل لکھتے رہتے ہیں اور سیدھا پن یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں، اسے چھپوا دیتے ہیں۔''

ژولیدہ بیان نقاد کا کند ذہن قاری

شہزاد منظر کی کتاب ''پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مبارک باد کسے دی جائے۔ شہزاد منظر کو یا خود اپنے آپ کو۔ وہ مبارک باد کے اس لئے مستحق ہیں کہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور ہم اس لئے کہ ہم نے اسے اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کا پڑھنا، اس کے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ تنقیدی کتاب لکھنا یوں آسان ہے کہ اس کے لئے صرف کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، جو بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ کسی تنقیدی کتاب کا پڑھنا یوں مشکل ہے کہ اس کے لئے فالتو عقل درکار ہے۔ ہم جیسے لوگ جن کے پاس روزمرہ امور میں کام آنے والی عقل بھی بقدر اشکِ بلبل ہوتی ہے، فالتو عقل رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح کتاب ہم نے پڑھ ڈالی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب مصنف کا سارا علم ہمارے پاس ہے، ہم تنقیدی مسائل پر نہ صرف گفتگو کر سکتے ہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ گویا اس علم سے مصنف کا یہ ایثار لائق تحسین ہے کہ وہ اپنا علم قارئین کے حوالے کر دے اور خود تہی دست ہو کر کتاب کی اشاعت سے حاصل ہونے والی روکھی سوکھی شہرت پر گزارا کرے۔

علم کی بات چلی ہے تو ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پاکستان کی اردو تنقید اور نقادوں کے بارے میں شہزاد منظر کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے تنقیدی ادب کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ان کی نظر میں نہ ہو۔ انہیں نہ صرف ہر نقاد کا کچا چٹھا معلوم ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون سی تنقیدی تحریر کب لکھی گئی اور ادب پر اس کے کیا اثرات ہوئے۔ شہزاد منظر کے علم کی وسعت کی ہم قسم کھا سکتے ہیں۔ گہرائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

کیونکہ کسی دوسرے کے علم کی گہرائی کو ناپنے کے لئے جس علم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہمارے پاس تو کیا، خود شہزاد منظر کے پاس بھی نہیں ہے ورنہ ہم انہیں سے مستعار لے کر ایک اور جھوٹی قسم بھی کھا سکتے تھے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد منظر کی زیر نظر تصنیف اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے جسے اردو تنقید سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں مختلف ادبی تحریکوں کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے نیز مختلف تنقیدی دبستانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں جو اہم مسائل اردو تنقید کا موضوع قرار پائے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں لیکن شہزاد منظر نے صرف معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جا بجا اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کی رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک سوچنے والا ذہن اور پرکھنے والی نظر رکھتے ہیں، ورنہ ہمارے ہاں تنقید بالعموم ان دونوں چیزوں کے بغیر لکھی جاتی ہے۔ شہزاد منظر نے یہ ستم ضرور کیا ہے کہ اپنی رائے کو "محاکمانہ تنقید" کا نام دیا ہے۔ "محاکمہ" فیصلے کہتے ہیں۔ کسی نقاد کے عدالت کی کرسی پر بیٹھ جانا ایک ایسی ستم ظریفی ہے جس کی بنا پر توہین عدالت کا مقدمہ چل سکتا ہے۔

مقدمے کے بعد کتاب میں اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، مظفر علی سید اور محمد علی صدیقی جیسے ممتاز نقادوں پر الگ الگ مضامین ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں کہ ان نقادوں کے علاوہ بھی پاکستان میں کم از کم نصف درجن نقاد ایسے ہیں جن پر لکھے بغیر کتاب کے موضوع سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ ان معترضین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی لکھا جا رہا ہے، جس میں باقی ماندہ نقادوں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ پر مضامین ہوں گے نیز کچھ پس ماندہ نقادوں یعنی نظیر صدیقی اور انیس ناگی وغیرہ کا تذکرہ ہوگا۔

شہزاد منظر جس "محاکمانہ تنقید" کے علمبردار ہیں، اسے اگر جرأت مندانہ تنقید کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جرأت اور دلیری سے کام لیتے ہوئے اپنی رایوں کے اظہار میں کسی مصلحت کو روا نہیں رکھا۔ اختر حسین رائے پوری، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور فکری

تضادات پر بھی نظر رکھی ہے۔ وہ ان تینوں نقادوں کے علم و فضل کے قدر دان ہیں اور ان کی تنقیدی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن ان کی جن باتوں سے اختلاف ہے، ان پر سخت الفاظ میں تنقید بھی کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ شہزاد منظر کی اختلافی آراء کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں، انہیں اس کی داد بہر حال ملنی چاہئے کہ وہ کسی بھی بڑے سے بڑے نقاد سے مرعوب نہیں ہوتے، اور اپنے علم کی حد تک جس بات کو درست سمجھتے ہیں، اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

شہزاد منظر نے نقادوں کے عیب و ہنر بیان کرتے ہوئے محمد علی صدیقی کے ساتھ یہ امتیاز برتا ہے یہ ان کے صرف عیبوں کو شایان التفات سمجھا ہے۔ انہیں سب سے زیادہ شکایت اس کی ہے کہ محمد علی صدیقی ژولیدہ بیان ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں، وہ قاری کی فہم سے بالا ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "محمد علی صدیقی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ بہت ہی پڑھے لکھے اور وسیع المطالعہ ناقد ہیں اور انہوں نے مشرق و مغرب کے تمام علوم و فنون کو گھول کر پی لیا ہے..... یہ تاثر ان کے مضامین کے عنوانات سے بھی ہوتا ہے۔ جن کا عام قاری پر ابلاغ ہو نہ ہو، رعب ضرور پڑتا ہے اور وہ جب ان مضامین کو پڑھتا ہے اور مصنف کی ژولیدہ بیانی اور گنجلک طرز اظہار کے باعث اس کے کچھ پلے نہیں پڑتا تو وہ اور بھی مرعوب ہو کر اپنے تئیں خود کو کند ذہن تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی بات صاف اور واضح طور پر کہنے کی بجائے بہت مبہم اور پیچیدہ انداز میں کہی جائے اور اس کا ابلاغ مشکل ہو تو قارئین کا احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ان کی بے پناہ علمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

اس اقتباس سے محمد علی صدیقی سے زیادہ ان کے قارئین کے عیوب سامنے آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو قاری خود کو کند ذہن سمجھتا ہے اور بات بات پر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے محمد علی صدیقی کی تحریریں پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اس کند ذہن قاری کے درد اور غم گسار شہزاد منظر بخوبی جانتے ہیں کہ ادب، کسی اخبار میں چھپنے والی خبر نہیں ہوتا جو بیک نظر سمجھ میں آ جائے۔ اس کے لئے ایک خاص ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص سطح کا علم درکار ہوتا ہے۔ کیا غالب اور بیدل کے دیوانوں کو اس لئے سوختنی قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں شاعروں کے بہت سے شعر بعض قارئین تو کیا نقادوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ محمد علی صدیقی کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں، ان پر کوئی دوسرا نقاد نہیں لکھتا۔ اس لئے اردو میڈیم

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

قاری یا نقاد کو ان کی تحریریں مشکل نظر آتی ہیں۔ نئے خیالات اپنے ساتھ نئی زبان بھی لے کر آتے ہیں۔ یہ بات جن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے، انہیں محمد علی صدیقی کی تحریروں سے اجتناب کرنا چاہئے اور صرف دت بھارتی اور ایم اسلم کے ناول پڑھنے چاہئیں۔

ژولیدہ بیانی کے مضمون کو شہزاد منظر نے سورنگ سے باندھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''محمد علی صدیقی گنجلک زبان لکھنے میں پہلے ہی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ژولیدہ بیانی کے باعث ادبی موضوعات پر ان کے مضامین کی تفہیم پہلے ہی مشکل تھی اس پر لسانیات کے موضوع پر ان کے مضامین نے ناقابلِ ابلاغ اور ناقابلِ فہم ہونے کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں یکے بعد دیگرے ماہرین لسانیات اور فلاسفر کے نام آتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے جن مشاہیر کا حوالہ دیا ہے، انہوں نے لسانیات کے میدان میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے یا ان کا نظریہ کیا ہے؟

لسانی مضامین محمد علی صدیقی کے ہوں یا کسی اور کے، عموماً کم ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ لسانیات بڑا موذی علم ہے جو ہلکی پھلکی تحریریں پڑھنے والوں پر اپنے راز منکشف نہیں کرتا۔ محمد علی صدیقی کے مضامین سمجھ میں نہ بھی آئیں تو قاری کو ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ کچھ ماہرین لسانیات کے نام تو کان میں پڑ جاتے ہیں۔ بحث و مباحثے کے لئے اتنا علم بھی کافی ہے۔ محمد علی صدیقی اگر تنقید کی بجائے پرائمری جماعتوں کے لئے نصابی کتابیں لکھنا شروع کر دیں تو شاید شہزاد منظر کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

محمد علی صدیقی نے اپنے کسی مضمون میں بنگالی مصنف سرت چندر چیٹرجی کا نام غلطی سے سرت چندر بوس لکھ دیا تھا۔ شہزاد منظر اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''محمد علی صدیقی نہ بنگلہ زبان و ادب سے واقف ہیں، نہ بنگلہ ادب کی تاریخ سے۔'' خود شہزاد منظر کا حال یہ ہے کہ انہوں نے کتاب میں کئی جگہ محمد دین تاثیر کو دین محمد تاثیر اور سرور جہاں آبادی کو سرور شاہ جہانپوری لکھا ہے۔ کیا ان غلطیوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف اردو زبان و ادب سے ناواقف ہیں؟ یہی نہیں انہوں نے مشہور مؤرخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کو ''اردو کے مشاہیر اہلِ قلم'' میں شمار کیا ہے۔ کیا اس لاعلمی کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہزاد منظر صاحب علم نہیں ہیں؟ وہ ایسی ہزاروں غلطیاں بھی کریں تو ان کے علم میں کمی نہیں ہو سکتی، ہاں پڑھنے والوں

کے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

شہزاد منظر نے ایک الزام یہ بھی عائد کیا ہے کہ محمد علی صدیقی کے بعض مضامین کے عنوانات مضامین کے متون سے مطابقت نہیں رکھتے۔ عنوان کچھ ہوتا ہے اور مضمون کچھ۔ جناب معترض کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ مضامین کی بات کر رہے ہیں، لوگ تو پوری پوری کتابوں کے گمراہ کن نام رکھتے ہیں۔ شہزاد منظر کی زیرِ نظر کتاب ۱۹۹۶ء میں چھپی تھی، اس وقت پاکستان کے قیام کو انچاس برس گزرے تھے۔ اس مناسبت سے کتاب کا نام ''پاکستان میں اردو تنقید کے انچاس سال'' ہونا چاہئے تھا مگر بیک جنبشِ قلم انچاس کو پچاس کر دیا گیا۔ محتاط لوگ تو محاورۃً بھی انیس برس کا فرق روا نہیں رکھتے لیکن شہزاد منظر نے انچاس کے فرق کے بھی نظر انداز کر دیا۔

کچھ عرصہ قبل شہزاد منظر نے محمد علی صدیقی کے ایک مضمون پر کسی رسالے میں تبصرہ لکھا تھا۔ اس کے حوالے سے وہ زیرِ نظر کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''تنقید نگاری میں بھی ہم مصلحت پسندی کے عادی ہیں اور بری اور گھٹیا تصنیف کو گھٹیا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اگر کوئی ناقد ایسا کرتا ہے تو مصنف سے لے کر مدیر تک سے اس کے تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں سچ بول کر تعلقات کو بگاڑ لینے کا خطرہ کون مول لے گا؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ میں نے محمد علی صدیقی کے ایک مضمون کی بعض کوتاہیوں کی نشان دہی کی تو ان سے مراسم بگڑ گئے۔ حالانکہ میں نے ان کی کتابوں پر لکھے ہوئے تبصروں اور اپنے انٹرویوز میں ان کی مکمل تعریف کی ہے، لیکن وہ میری محاکمانہ تنقید برداشت نہ کر سکے۔ میں نے اپنے مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جو ان کے شان یا مرتبے کے خلاف ہو یا جس سے توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ میں نے ان سے صرف اختلاف کیا تھا اور ان سے بعض ناقدین کے بارے میں سرزد ہونے والی ناانصافیوں کی شکایت کی تھی۔''

معلوم ہوتا ہے، زیرِ نظر کتاب میں شامل مضمون تعلقات کو مزید بگاڑنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ ایسی ''محاکمانہ تنقید'' کس کام کی، جس سے تعلقات خراب ہوں۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

غیر شاعرانہ شاعری

جناب راغب مراد آبادی کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی تازہ کتاب ''روشنیوں کے شہر'' مطالعے اور تبصرے کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر انہوں نے ازراہِ لطف و کرم ہمارے لئے جو تعریفی کلمات لکھے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اپنے بارے میں ہماری تحریروں کو وہ نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ مزید خامہ فرسائی کے متمنی بھی ہیں۔ اس حوصلہ افزائی کے شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں، البتہ کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں اور وہی ہم موصوف کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

جو لوگ شاعری اور موزونیِ طبع کے نازک فرق کو سمجھتے ہیں، وہ اس سے ضرور اتفاق کریں گے کہ موجودہ دور میں جناب راغب جیسا قادر الکلام کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ جس موضوع پر عنایت کی نظر کرتے ہیں، وہ رواں دواں مصرعوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر کبھی تعزیراتِ پاکستان کو منظوم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو یہ کام صرف راغب صاحب ہی انجام دے سکیں گے کہ انہیں عروض کی ہر بحر پر عبور حاصل ہے۔ صرف عروض کی بحروں پر پوری اترنے والی شاعری بالآخر بحرِ عرب کے لئے بھی قابلِ قبول ہو جاتی ہے اور یوں عروض کی بحروں میں ایک اور بحر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے دور میں کراچی پر جو قیامت گزری، جناب راغب نے اسے بچشمِ خود دیکھا ہے اور زیرِ نظر کتاب میں بقلمِ خود بیان کر دیا ہے۔ کتاب میں کچھ نظمیں اور بہت سی رباعیات جن میں دہشت گردی اور دہشت گردوں کو موضوع بنایا گیا ہے، نیز یکم نومبر سے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ء تک

کے اخبارات کی خاص خاص خبروں کو منظوم کر دیا گیا ہے۔ رباعی سے جناب راغب کو طبعی مناسبت ہے۔ بقول دیباچہ نگار سحر انصاری ''رباعی پر راغب صاحب کو جو ملکہ حاصل ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس مشکل صنفِ سخن کو وہ اس طرح برتتے ہیں جیسے کوزہ گر اپنی مٹی کو۔'' کوزہ گر مٹی سے کوزہ بناتا ہے، راغب صاحب نے یہ کمال دکھایا ہے کہ رباعی کو مٹی میں ملا دیا ہے اور پھر اس مٹی کو بطور شاعری پیش کیا۔ ذرا اس شاعری کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔ ۶-نومبر ۱۹۹۵ء کے اخبار ''جنگ'' میں خبر چھپی کہ نامعلوم افراد نے نارتھ ناظم آباد میں ایک معمر خاتون کا گلا کاٹ دیا۔ راغب صاحب شاعری کا گلا کاٹتے ہوئے فرماتے ہیں:

سال و سن کا لحاظ بھی تو نہ کیا
کیا ظالموں کے دل میں نہ تھا، خوفِ خدا
افسردہ نہ کیوں ہو، نارتھ ناظم آباد
خاتون معمر کا گلا کاٹ دیا

روزنامہ ''عوام'' کراچی میں ۱۱-نومبر ۱۹۹۵ء کو ایک خبر چھپی کہ لیاقت آباد میں بوری بند لاش ملی۔ راغب صاحب اس خبر کو رباعی کی بوری میں یوں بند کرتے ہیں:

خربوزے نہ آم کی کوئی قاش ملی
آئینۂ سفاکیِ اوباش ملی
ہیں آج بلب اہلِ لیاقت آباد
بوری میں یہاں بند انہیں ایک لاش ملی

جس طرح بوری میں خربوزے اور آم کی قاش کو تلاش کرنے کا خیال بالکل اچھوتا ہے، اسی طرح سفاکیِ اوباش کے آئینے کو مونث بنا دینا بھی بالکل نئی بات ہے۔

روزنامہ ''عوام'' میں ۱۳-نومبر ۱۹۹۵ء کو ایک ۳۵ سالہ شخص عبدالوحید کے قتل ہونے کی خبر شائع ہوئی۔ اس خبر کو منظوم کرتے ہوئے چوتھے مصرعے میں شاعر نے اپنے تخلص کو جس طرح استعمال کیا ہے، اس کی داد اہلِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔

دہشت گردوں کا منہ ہو یا رب کالا
نازوں سے تھا ماں باپ نے جس کو پالا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

ان فتنہ گروں نے مار ڈالا آخر
راغب، عبدالوحید پینتیس سالہ

۵-دسمبر ۱۹۹۵ء کے "جنگ" میں خبر چھپی۔ لیاقت آباد میں چھاپہ۔ ۹ راکٹ، ۲۲ بم برآمد۔ ملزم فرار ہو گئے۔ اس خبر کو شاعرانہ محاسن کے ساتھ یوں پیش کیا گیا ہے:

چھاپے سے نہ بچ سکے لیاقت آباد
برآمد اسلحہ تھی اس کی بنیاد
۲۲ ملے ہیں بم فقط نو راکٹ
ملزم تو نہ ہاتھ آئے، بر آئی نہ مراد

مصرعے میں لفظ "فقط" کے استعمال سے شاعر نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بموں کے مقابلے پر راکٹوں کی تعداد کم تھی۔

راغب صاحب نے ہلاکتوں کی خبروں کو بھی نہایت خوب صورت انداز میں منظوم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کورنگی میں فائرنگ سے بھگدڑ جو مچی
زخمی ہوئے دس، سات کی تو جان گئی
خاتون بھی ہے ایک انہیں میں شامل
شہر قائد میں اُف یہ دہشت گردی

شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ خاتون زخمیوں میں شامل ہے یا ہلاک شدگان میں۔ یہ بالکل غالب کا سا انداز ہے۔ وہ بھی اپنے بعض شعروں میں مفہوم کے کسی پہلو کو سہواً اظہار رہنے دیتے تھے تاکہ قاری اپنی عقل سے کام لے کر معنی کی گم شدہ کڑی کو تلاش کر سکے۔

جناب راغب کے شاعرانہ کمالات سے آگاہی کے لئے صرف اتنے ہی نمونے کافی ہیں۔ جنہیں اس قسم کی ہلاکتوں کی اخباری شاعری سے دلچسپی ہو، انہیں اصل کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے لیکن اس میں احتیاط ضروری ہے کہ کتاب کے مطالعے سے بھی ہلاکتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخباری خبروں کو منظوم کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کے لئے کتاب کی تصنیف کی پس منظر جاننا ضروری ہے۔ ۲-جون ۱۹۹۶ء کو راغب صاحب نے سابق

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا ایک قصیدہ لکھا جو ہم ایک کالم میں بخطِ شاعر شائع کر چکے ہیں۔ اس قصیدے کے عوض بے نظیر نے راغب صاحب کو ایک لاکھ روپے کے انعام سے نوازا۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں اس پر شدید ردِ عمل ظاہر کیا گیا کہ راغب صاحب نے کراچی کے شہیدوں کے خون بہا وصول کیا ہے۔ اس داغ کو دھونے کے لئے زیرِ نظر کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس پر تاریخ طباعت ۳۱-دسمبر ۱۹۹۵ء درج کی گئی ہے اور یہ نہ سوچا گیا کہ جس کتاب میں ۳۰-دسمبر ۱۹۹۵ء کی ایک منظوم خبر شامل ہے، وہ دوسرے ہی دن کس طرح منظرِ عام پر آ سکتی ہے۔

مصنف کی ایک بات قابلِ داد ہے کہ انہوں نے کراچی کے حالات پر کتاب لکھتے ہوئے کسی مصلحت سے کام نہیں لیا اور جس بات کو درست سمجھا ہے، اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ جنرل نصر اللہ بابر نے "دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے بہانے خود جس دہشت گردی کا مظاہرہ کیا، اس کی داد راغب صاحب نے ان الفاظ میں دی ہے:

ہر چند کہ بد نام ہے دہشت گردی
کیا بات ہے کیوں عام ہے دہشت گردی
جنرل بابر کا نام سن کر راغب
کیا لرزہ بر اندام ہے دہشت گردی

اہلِ کراچی پر جو کچھ گزری، اسے راغب صاحب اہلِ کراچی کے اعمال کی سزا قرار دیتے ہیں:

یہ روشنیوں کا شہر اللہ اللہ
نورِ دو چشم اللہ اللہ
کس کے اعمال کی سزا ہے کہ یہ شہر
ہے زیرِ عتاب و قہر اللہ اللہ

وہ اہلِ کراچی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں:

مانگو اللہ سے معافی جھٹ پٹ
دن امن و اماں کے کاش جلد آئیں پلٹ

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

نوبت نہ کہیں فاقہ کشی تک پہنچے
ہنگاموں نے کر دی ہے معیشت تلپٹ

کراچی کے شام کے اخباروں نے جس ہمت وجرأت کے ساتھ رپورٹنگ کی، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ سابقہ حکومت نے بیک جنبشِ قلم شام کے چھ اخبار بند کر دیئے تھے لیکن راغب صاحب کا خیال ہے کہ یہ اخبار اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے چٹ پٹی خبریں شائع کرتے تھے:

ممکن ہے بڑھے آمدنی یاروں کی
خبریں بھی ہیں چٹ پٹی خبر رساں کی
آئینۂ دل کو جو مکدّر کر دیں
وہ سرخیاں ہیں شام کے اخباروں کی

کراچی میں پولیس نے جو ظلم کئے اور جعلی مقابلوں میں جو بے شمار لوگ قتل کئے، پوری کتاب میں ان کا کوئی ذکر نہیں، لیکن تھانوں کے خلاف جو جوابی کارروائیاں ہوئیں، راغب صاحب ان پر افسردہ خاطر نظر آتے ہیں اور اپنے اس غم کا انہوں نے کئی رباعیوں میں اظہار کیا ہے۔ مثلاً

آجائیں نہ زد میں اک نہ اک دن ہم بھی
بے شک سوہانِ روح ہے یہ غم بھی
ہاں گلشنِ اقبال کے تھانے ہی پر
راکٹ بھی گرے ہیں اور دستی بم بھی

کراچی میں آئے دن ہڑتالیں ہوتی تھیں اور یہ ہڑتالیں، غلط یا درست، احتجاج کا ایک ذریعہ تھیں۔ راغب صاحب نے اپنی کتاب میں ان ہڑتالوں کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے، سابقہ حکومت کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ مثلاً

کیوں اہلِ کراچی کے نہ غم ہوں اوسان
ہے آہ بلب اسٹاک ایکسچینج کی جان

دہشت گردی سے اور ہڑتالوں سے
دو سال میں دس کھرب روپے کا نقصان

ہنگاموں کے دنوں میں ایک مرتبہ بے نظیر بھٹو کراچی آئیں تو راغب صاحب نے خوش ہو کر یہ رباعی لکھی:

دہشت گردی کا زور اے کاش ہو کم
افراتفری سے آ گیا ناک میں دم
حالات کے تجزیے کی خاطر ہیں مقیم
منگل سے کراچی میں وزیرِ اعظم

کتاب میں جو چند نظمیں شامل ہیں، ان کا معیار بھی رباعیوں سے کم نہیں ہے۔ ایک نظم کے چند شعر سنئے اور شاعر کی بلند خیالی کی داد دیجئے:

جاں بحق منّی کی بیٹی ہو گئی
ہو گیا گلشن کا برخوردار قتل
جان سے کچھ آج لانڈھی میں گئے
ہوں گے کل کچھ اہلِ گولی مار قتل
دیکھئے ہوتا ہے کیا ردِّ عمل
ہو گیا ہے ایک تھانے دار قتل

ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین کے بیرونِ ملک قیام پر راغب صاحب کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

خیر ہو تیری نا خدا ناؤ جو ڈوبنے لگی
اس سے تو خود اتر گیا، مجھ کو سوار کر دیا

حالاتِ حاضرہ کو شاعری کا موضوع بنانا ایک نہایت مشکل کام ہے، اس کے لئے صرف قادر الکلامی کی نہیں، اس نظر کی بھی ضرورت ہے جو حالات و واقعات کے باطن میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اہلِ اردو میں یہ نظر صرف اکبر الٰہ آبادی، ظفر علی خاں اور رئیس امروہوی کے پاس تھی۔ کوئی چوتھا شاعر ایسا نہیں ہے کہ اس سلسلے میں اس کا نام لیا جائے۔ ویسے ہر اچھا شاعر

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ کراچی کے حالات سے متاثر ہو کر بعض غزل گو شاعروں نے اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہا ہے لیکن ایک جدید شاعر گلنار آفریں نے کراچی کے حالات کو جس تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ گلنار آفریں کا مجموعۂ کلام "تیشۂ غم" اگست ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں دو درجن سے زیادہ نظمیں کراچی کے بارے میں ہیں اور ہر نظم میں ایک سچے شاعر اور حساس شہری کا کرب جھلکتا ہے۔ گلنار آفریں نے بڑی جرأت اور بے باکی سے وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جو ان کے دور کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کہہ سکا۔ کراچی کے شہریوں پر ماضی قریب میں جو قیامت گزری، وہ راغب مراد آبادی کے لئے صرف خبر کا درجہ رکھتی ہے جسے صحافیانہ انداز سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ گلنار آفریں کے لئے یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کے بیان کے لئے فن کارانہ بصارت و بصیرت کی ضرورت ہے۔ گمان غالب ہے کہ راغب مراد آبادی نے گلنار آفریں کے مجموعہ کلام کی مقبولیت سے متاثر ہو ہی اپنا مجموعہ مرتب کیا، لیکن بات بنی نہیں۔

گلنار آفریں کی ایک مشہور نظم ہے: "قائد اعظم سے خطاب" جس میں روحِ قائد کو اپنا پاکستان دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے اور کراچی کے حوالہ سے پوچھا گیا ہے کہ کیا یہ وہی پاکستان ہے جس کے لئے ان گنت قربانیاں دی گئی تھیں اور جہاں آج یہ حال ہے کہ "چور لٹیرے، قاتل سارے شہر کے چوکیدار ہوئے۔" اسی انداز کی دو تین نظمیں راغب مراد آبادی نے بھی لکھی ہیں لیکن انہوں نے کراچی اور اہلِ کراچی کی جو تصویریں پیش کی ہیں، وہ انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں وہ اہلِ کراچی کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا حفظِ مراتب ہوتا ہے ، یہ رسم یہاں افسانہ ہے
محرومِ محبت ہیں آنکھیں، اخلاص سے دل بیگانہ ہے
آتے نہیں کام اپنے بھی یہاں، پڑتا ہے کسی پر وقت اگر
اللہ یہ زوالِ نوعِ بشر ، اللہ یہ دورِ دولت و زر
جو چشمِ ہوس سے پنہاں تھے، جلوے وہ یہاں مستور نہیں
چہروں پہ حیا کا رنگ نہیں، آنکھوں میں وفا کا نور نہیں

عصمت کے جواہر بکتے ہیں ہر سمت یہاں بازاروں میں
افسردہ نظر آتے ہیں جو گل ہوتے ہیں گلے کے ہاروں میں

کراچی کے زخموں پر ایسا نمک شاید ہی کسی نے چھڑکا ہوگا۔ اس نظم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی نظم کو ۱۹۹۶ء میں شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس میں اہلِ کراچی کو اخلاص، حیا اور وفا سے بیگانہ بتایا گیا ہو اور کراچی کے بازاروں میں عصمت کے جواہر بکتے ہوئے دکھائے گئے ہوں۔

WWW.KITAABISTAN.COM

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

شرمندہ ہیں وہ اپنے کمالوں کے سامنے

آج کل ساقی فاروقی کی شہرت کا ستارہ اوج پر ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کے خلاف نو بنو اور نوع بنوع تحریروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معاندانہ مراسلہ نگاری بھی زوروں پر ہے۔ لندن میں بھی، جہاں ساقی پچھلے ۳۰، ۳۵ برسوں سے مقیم ہے، اس نے اپنے قدر دانوں کا ایک خاصا بڑا حلقہ پیدا کرلیا ہے۔ یہ قدر دان مراسلہ نگاری سے دل بہلاتے ہیں۔ ساقی کی ذات وصفات کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں لکھ کر پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں مراسلے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے اس کا کہ ساقی جاو بے جا زبانِ قلم سے آلاتِ حرب وضرب کا کام لیتا ہے۔ جو منہ میں اور زبانِ قلم پر آتا ہے، اسے معرضِ اظہار میں لے آتا ہے۔ اس گرمیِ گفتار سے جن لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے، وہ مضامین اور مراسلوں کی صورت میں دل کا غبار نکالتے ہیں۔ ہم نے ساقی کو کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ لوگوں کی دل آزاری نہ کیا کرو۔ یہ مقصد جب شاعری سے حاصل ہوجاتا ہے تو پھر گفتگو اور نثر میں دشنام افشانی کی کیا ضرورت ہے، مگر ساقی نے کب کسی کی بات مانی ہے جو ہمارا مشورہ قبول کرتا۔

ساقی عجیب آدمی ہے کہ دوسروں سے بھی لڑتا ہے اور اپنے آپ سے بھی۔ دوسروں سے لڑائی کا حاصل دشنام افشانی ہے اور اپنے آپ سے لڑنے کا نتیجہ شاعری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ساقی کو کوئی لاکھ کچھ کہے، اس میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شاعری کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یا یوں کہئے کہ شاعری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہر سال دو چار نظمیں، غزلیں ایسی ضرور لکھ دیتا ہے جن سے اس کے شاعرانہ قد وقامت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ خیر یہ تو مذاق کی بات ہے، جو سنجیدہ بات ہمیں اس وقت بتانی ہے وہ یہ ہے کہ ساقی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ''حاجی پانی والا اور

دوسری غزلیں اور نظمیں'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔

کسی مجموعہ کلام کا اتنا طویل نام پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اردو میں ایک لفظی یا دو لفظی نام رکھنے کا رواج ہے اور اگر کوئی شاعر فضول خرچی پر مائل ہوا تو نوبت تین چار لفظوں تک پہنچ جاتی ہے مگر پورے نو لفظوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں مجموعے کی پیشانی پر لٹکا دینا ساقی ہی کا کمال ہے۔ یہ کمال ویسے ہی کمالوں جیسا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے منیر شکوہ آبادی نے کہا تھا: شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے۔ ایسی بات منیر نیازی نہیں کہہ سکتے کہ انکی شعری لغت میں لفظ ''شرمندگی'' موجود نہیں ہے۔ وہ کراچی کے شاعروں کو خراب شاعر کہہ کر نادم نہیں ہوتے بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے سچ بات کہہ دی اور کراچی کے بعض شاعر بھی ان کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے اپنے مجموعوں پر ان سے دیباچے اور فلیپ لکھواتے ہیں۔

ساقی کا نیا مجموعہ لندن سے شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس کی کتابیں لاہور، کراچی اور دہلی کے ناشر چھاپتے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے برصغیر کے ناشروں میں مزید بار اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، نتیجہ بہتر نکلا ہے کہ مجموعہ نہایت آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔ کاغذ خاصا دبیز ہے، جس سے مجموعے کے وزن میں اضافہ ہوا ہے۔ ظاہر ہے مجموعے کے وزن کا شاعری کے وزن سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وزن کے حوالے سے خلطِ مبحث کو راہ نہ دی جائے۔

اس مجموعے میں ساقی کا تازہ ترین کلام ہے۔ دس نظمیں ہیں اور اتنی ہی غزلیں۔ یہ شاعری لب ولہجہ کے اعتبار ہی سے نہیں، موضوعات کی بنا پر بھی موجود عہد کی شاعری سے یکسر مختلف ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ساقی اپنی پوری زندگی دو بالکل مختلف دنیاؤں کے شہری کی حیثیت سے گزاری ہے۔ اس کا خمیر مشرق سے اٹھا اور ذہنی نشو ونما مغرب میں ہوئی۔ ایسے لوگ عموماً اپنے تہذیبی ماضی سے کٹ کر ان آرائشی پودوں کی طرح زندگی بسر کردیتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں نہیں ہوتیں۔ ساقی نے اس طرح زندگی نہیں گزاری۔ اس نے اپنی جڑوں کو اپنی مٹی ہی میں رہنے دیا، اور اجنبی آب وہوا اور فضا میں پنپنے کا ہنر بھی سیکھ لیا۔

ساقی کی اپنے تہذیبی ماضی سے وابستگی زبان کے ذریعے سے قائم ہے اور نئی دنیا سے وابستگی خیال کے ذریعے سے۔ خیال سے مراد بیسویں صدی کا وہ علمی وسائنسی شعور ہے جو انسان

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اور کائنات کے درمیان نئے رشتوں کا سراغ لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی کی شاعری اپنے موضوعات کے حوالے سے ایک نئی دنیا میں لے جاتی ہیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے پرانی دنیا ہی میں سانس لیتی ہے۔ وہ بعض نئے شاعروں کی طرح زبان میں مضحکہ خیز سلوک نہیں کرتا بلکہ اس کی روایتی ساخت کے اندر رہتے ہوئے پرانے لفظوں ہی کے ذریعے نئے مفاہیم و مطالب ادا کرتا ہے اور اس طرح کہ پرانے لفظ بھی نئے نظر آتے ہیں۔ زبان کا یہ تخلیقی استعمال ن۔م راشد کے بعد صرف ساقی کے حصے میں آیا ہے۔

ساقی کے موضوعاتِ سخن پر نظر ڈالی جائے تو دلچسپ صورتِ حال نظر آتی ہے۔ بعض نظمیں (مثلاً حاجی بھائی پانی والا اور مستانہ نجرا) صرف وہی شاعر لکھ سکتا ہے جو مشرق کی تہذیبی زندگی سے پوری طرح واقف ہو اور بعض نظمیں (جیسے بندہ مومن کا ہاتھ) ایسی ہیں جو کراچی، لاہور اور دہلی کا کوئی شاعر لکھ ہی نہیں سکتا کہ ان میں مغرب، بے باکی کی حد تک بے حجاب اور روحانی اقدار سے برگشتہ نظر آتا ہے۔

راشد کی طرح ساقی پر یگانہ کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کہیں ناراض اور اکھڑا اکھڑا سا لہجہ یگانہ کی یاد دلاتا ہے اور کہیں کہیں کوئی ایسی بات بھی مل جاتی ہے جو یگانہ کے کسی شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ساقی کی ایک مختصر نظم ہے۔ "لشکر کشی"

خوف سے مکالمہ نہ کر
حوصلہ نہ ہار
روح کا محاصرہ نہ کر
زخم سے معافیاں نہ مانگ
موت سے معاہدہ نہ کر
جنگ اختیار کر کے دیکھ
صلح کا مطالبہ نہ کر
درد کے خلاف لیس ہو
یاد کا مقابلہ نہ کر

اس نظم کو پڑھتے ہوئے یگانہ کا یہ شعر ذہن میں آ جاتا ہے:

امید صلح کیا ہو کسی حق پرست سے
پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا ہو

اوپر کے تین چار پیراگراف ہم نے پڑھے تو اندازہ ہوا کہ ہم اچھے خاصے تنقید نگار بن گئے ہیں اور کتابوں کی رونمائیوں میں تعریفی مضامین پڑھ کر داد حاصل کر سکتے ہیں مگر ہمیں معلوم ہے کہ اتنی بہت سی تعریف بھی ساقی کے لئے کم سے کم ہوگی کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ میر تقی میر کے بعد دوسرا خدائے سخن ہے۔ مروت میں ہم یہ بات بھی مان لیتے لیکن میر صاحب مرحوم و مغفور کی عزت سے کھیلنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

مجموعے میں شامل انگریزی نظمیں پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اردو کی طرح ساقی کو انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہے۔ جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں کی بامحاورہ اردو سے تو ہم واقف تھے، اب انہیں سیڑھیوں کی انگریزی بھی دیکھ لی۔ انگریزی میں اردوئے معلّیٰ کی لنک اور جھلک پیدا کرنا ساقی ہی کے بس کی بات ہے۔ خدا کرے انگریزی نقادوں میں کوئی شمس الرحمٰن فاروقی پیدا ہو جائے جو ساقی کے شاعرانہ کمالات سے اہلِ مغرب کو آگاہ کرے۔

زیرِ نظر مجموعے کا دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "ساقی کی شاعری کئی معنی میں ہمارے زمانے میں عدیم المثال اور بے نظیر شاعری ہے۔" اور اختتام ان الفاظ پر: "ساقی فاروقی کا کلام لازماں ہے کیونکہ اس میں معاصر حقیقت اور جدید تجربے کو فن کا پورا شعور اور پورے فن کا شعور مل گیا ہے۔ ساقی کے یہاں حقیقت کو فن کی شکل دینے کے تمام طریقے اور خود فن کی تمام شکلیں موجود ہیں۔"

نقاد فاروقی نے شاعر فاروقی کی شاعری پر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے کہ اپنی ایسی تعریف تو خود ساقی بھی نہیں کر سکتا، مگر ساقی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ دیباچہ پڑھ کر شکوہ کرے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے میر تقی میر پر تو پوری چار جلدیں لکھ ڈالیں اور مجھ پر پورے چار صفحے بھی نہ لکھے۔ اس شکوے کے جواب میں ہم ساقی سے کہیں گے کہ تھوڑے لکھے کو بہت جانو۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے ساڑھے تین صفحے، عام نقادوں کے ساڑھے تین سو صفحوں پر بھاری ہیں۔ آنے والا زمانہ یہ نہیں دیکھے گا کہ تم نے کیا لکھا، بلکہ یہ دیکھے گا کہ تمہارے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا لکھا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا ذکر آیا ہے تو کیوں نہ ہم انہیں سرلا سرسوتی ایوارڈ ملنے پر مبارکباد

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

پیش کر دیں۔ اس ایوارڈ کے ساتھ پانچ لاکھ روپے بھی ملتے ہیں۔ رقم کے اعتبار سے یہ ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی انعام ہے جو بہترین کتابوں پر دیا جاتا ہے۔ فاروقی کو یہ ایوارڈ "شعر شور انگیز" پر ملا ہے جو جدید اردو تنقید کا گل سرسبد ہے۔ ہر عہد اپنے بڑے شاعروں کو از سر نو دریافت کرتا تھا۔ اس کتاب میں موجودہ دور میں میر کی شاعری کی معنویت اجاگر کی گئی ہے۔ میر کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ساقی کی شاعری کو "عدیم المثال" اور "بے نظیر" کہا ہے۔ اگر شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کے لئے بھی یہ الفاظ استعمال کئے جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مشرق و مغرب کے ادبیات پر جیسی گہری نظر ان کی ہے، اس کی مثالیں کمیاب تو کیا نایاب ہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے عہد کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

کتابیں اور راگ راگنیاں

ڈاکٹر داؤد رہبر عجیب و غریب آدمی ہیں۔ عجیب ان معنوں میں کہ پوری زندگی کتابوں اور راگ راگنیوں کے درمیان گزار دی، اور غریب یوں کہ تقریباً نصف صدی سے غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ساڑھے چار سال کیمبرج میں رہے، پھر کینیڈا اور ترکی میں کچھ عرصہ گزارا اور ۱۹۵۹ء سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ وہ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو، چاروں زبانوں سے علمی و ادبی تعلق رکھتے ہیں اور انگریزی کے توسط سے باقی تین زبانیں پڑھاتے رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے ذوق و شوق کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ برصغیر کی تاریخ و تہذیب سے لے کر ادیانِ عالم کے تقابلی مطالعے تک کتنے ہی موضوع ان کے موضوعاتِ تحقیق بنتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کی کلاسیکی موسیقی سے ان کا علمی و عملی تعلق ایسا مربوط و مضبوط رہا کہ وہ نہ صرف آواز کا جادو جگاتے رہے اور اس موضوع پر کتابیں اور مقالے بھی لکھتے رہے۔ ان کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے جس میں علم موسیقی کی رموز و نکات کا تذکرہ بھی ہے اور ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اساتذۂ فن کے کمالات کا بیان بھی۔

نصف صدی کی خود عائد کردہ جلاوطنی کی صعوبتوں کو کم کرنے کے لئے ڈاکٹر داؤد رہبر نے موسیقی کے ساتھ ساتھ شاعری، یادنگاری اور خطوط نویسی کی دنیا بھی آباد کی، اور جب سے یونیورسٹی کی ملازمت سے آزاد ہوئے ہیں، اسی دنیا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ سو شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کئی غزلیں، ایک طویل مثنوی "آسماں پیداست" اور ایک طویل نظم "پراچین" لکھ چکے ہیں۔ بہت سی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ امریکہ کے اردو شاعر کو ہمارے شاعروں کی طرح طباعتی سہولتیں میسر نہیں ہیں، اس لئے ڈاکٹر داؤد رہبر نے کلام کی اشاعت کی یہ طریقہ نکالا ہے کہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اپنے ہاتھ سے لکھ کر سو پچاس فوٹو اسٹیٹ نسخے تیار کر لیتے ہیں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اپنے کلام کو وہ ایک جریدے کی صورت میں بھی شائع کرتے ہیں۔ جہاں دس بیس غزلیں جمع ہوئیں، جریدے کا ایک شمارہ شائع کر دیا۔ اس جریدے کا نام "تسلیمات" ہے اور ۱۹۹۶ء کے شروع تک اس کے ۲۵ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان روایتی معنوں میں شاعری نہیں ہے جس سے ہمارے عام شاعروں کے دیوان گراں بار ہوتے ہیں۔ یہ اپنے تہذیبی و ثقافتی ماضی سے وابستگی کا ایک وسیلہ ہے، جو کچھ ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں اور جو کچھ نہیں ہے، اسے ان کی نظریں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ خصوصاً ان بچھڑے ہوئے لوگوں کو جو ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں۔

عشاق کو بس غیب سے اتنا ہے علاقہ
بچھڑے ہوئے پیاروں کی کوئی پھر خبر آئے

ہجرت اور ہجرت کی بے کسی بھی ان کا پسندیدہ موضوع ہے:

اک مہاجر کا یہ دکھڑا ہے کہ ہے وہ بے زمین
اک مسافر کی یہ حسرت ہے کہ اس کو چھت ملے
انکسار، ایثار، فقر اور ترکِ دنیا خوب ہیں
پر کسی کی بے کسی سب سے بڑی سچائی ہے

یادنگاری میں سرِ فہرست ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی ہے جو انہوں نے انگریزی میں اس لئے لکھی کہ دیارِ غیر میں جن لوگوں سے ان کا سابقہ ہے، انہیں اپنے تہذیبی پس منظر سے آگاہ کر سکیں۔ اردو میں انہوں نے بہت سے شخصی خاکے لکھے ہیں جو ہیں تو افراد کے بارے میں لیکن ان کا اصل موضوع گزرے ہوئے لمحے ہیں۔ آج کل رسالہ "علامت" لاہور میں اردو کی بعض آپ بیتیوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مقالہ بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی یادوں کے حوالے سے بعض شخصیات (پطرس بخاری، صوفی تبسم، ن م راشد وغیرہ) کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ یہ مقالہ آپ بیتی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

پردیس میں وطن سے دوری کا غم اس وقت شدید ہو جاتا ہے جب دور دور تک کوئی ہم زبان نظر نہ آئے۔ شاعری اور یادنگاری سے گزرے ہوئے لمحوں کی بازیافت تو ممکن ہے لیکن ہم

کلامی کی مسرت کے حصول کے لئے ڈاکٹر صاحب نے خطوط نویسی کا سہارا لیا۔ یہ راستہ انہیں غالب نے دکھایا جو اپنی تنہائی کا مداوا خط لکھ کر کرتے تھے۔ غالب کے خطوں سے ڈاکٹر داؤد رہبر کو جو دلچسپی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ غالب کے تقریباً دو سو خطوں کو انگریزی میں منتقل کر کے کتابی صورت میں شائع کر چکے ہیں۔ ان خطوں پر انہوں نے مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنایا تھا، ڈاکٹر داؤد رہبر نے اسے فنِ لطیف کی صورت دے دی ہے، جس کا ثبوت ان کے خطوط کا مجموعہ "سلام و پیام" ہے جو حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے اسی کے تعارف کے لئے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنی سرزمین سے دور، اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے منسلک رہنے کے لئے تحریری ہم کلامی یعنی خطوط نویسی کا آغاز ۱۹۶۱ء میں کیا۔ اس وقت سے ۱۹۹۶ء تک انہوں نے اڑھائی تین ہزار خط لکھے ہوں گے۔ شروع شروع میں تو وہ خط لکھتے رہے اور مکتوب الیہم کو بھیجتے رہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ ان خطوں میں بہت سی ایسی باتیں آ جاتی ہیں جو آگے چل کر ماضی کی بازیافت میں کام آئیں گی لہٰذا کیوں نہ ان خطوط کو محفوظ کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے خطوں کی نقلیں اپنے پاس رکھنے شروع کر دیں۔ جب اعجاز بٹالوی کی تحریک پر ضیاء محی الدین نے ڈاکٹر داؤد رہبر کو خطوں کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے اپنے خطوں کا ایک انتخاب مرتب کر دیا۔ یہی انتخاب "سلام و پیام" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ایک سو کے قریب مکتوب الیہم کے نام پانچ سو سے زیادہ خطوط ہیں۔ یہ خطوط دوستوں، عزیزوں اور ادیبوں کے نام ہیں۔ بڑی تعداد ادیبوں کے نام کے خطوط کی ہے۔ ان میں مولانا صلاح الدین احمد، مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر آل احمد سرور، مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مالک رام، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے بہت سے مشاہیر ادب شامل ہیں۔

ان خطوں کا سب سے اہم اور پہلا وصف ان کی بے تکلفانہ فضا ہے۔ خط کسی بزرگ کے نام ہو یا کسی خرد کے نام یا کسی ہم عمر کے نام، لکھنے والا حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتا ہے کہ خط ایک رسمی تحریر کی بجائے ادب پارہ بن جاتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد (مدیر "ادبی دنیا") مکتوب نگار کے بزرگ تھے۔ وہ کسی کو کم ہی خط لکھتے تھے۔ اس کی شکایت ڈاکٹر داؤد رہبر یوں کرتے ہیں: "آپ کو خط لکھنے کا بہانہ بھی درکار نہیں۔ جب لکھتا ہوں، لکھنے بیٹھ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

جاتا ہوں اور سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی کہ کیا لکھوں۔ باتیں جی میں چلی آتی ہیں اور صفحہ ختم جاتا ہے اور ادھوری کہانی کی دلکشی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ آپ کبھی کبھار لکھتے ہیں۔ میرے چھ خطوں کے جواب میں آپ کا ایک خط۔ گل و بلبل کے افسانے سے پھر بھی ہماری داستان اچھی ہے۔

یہی شکایت بہ انداز دیگر یوں دہرائی ہے: ''مولانا چند روز خاموش رہنا بھی مناسب ہے۔ وہ جو بہت بولتے ہیں، دل کو کم ٹٹولتے ہیں، چنانچہ اگر آپ کو خط نہ لکھا تو یہی جانئے کہ مراقبہ تھا، اور ادھر آپ کے مراقبے تو شب ہجر اور گیسوئے پیچاں سے بڑھ کر دراز ہیں، آپ نے ہمیں کب خط لکھا کہ ادھر سے اپنی خموشی کی معذرت کی جائے۔''

یہی شکایت جب وہ اپنے تایا زاد بھائی اور مشہور فن کار ضیاء محی الدین سے کرتے ہیں تو اس کا انداز مختلف ہوتا ہے: ''تم نے فرض کر لیا کہ یہ آدمی انشا پردازی کے لئے خط لکھتا ہے، اس لئے اس کے خطوں کا جواب کیا لکھیں۔ اول تو یہ کہ تم نے مجھے منشی ہرگوپال تفتہ سمجھ لیا۔ دوم یہ کہ خط کا جواب لکھنا آئینِ وضع داری میں شامل ہے۔ اجی انشا پردازی کی ایسی تیسی۔ انشاء اللہ ہم خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔''

مشہور قانون دان اعجاز بٹالوی مکتوب نگار کے گہرے اور پرانے دوست ہیں۔ وہ خط لکھنے میں کچھ زیادہ ''کشادہ دست'' نہیں ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق بٹالوی سے ان کی شکایت یوں کی جاتی ہے: ''کیا اعجاز سے آپ کی خط و کتابت رہتی ہے؟ آئندہ اس کو لکھیں تو میرا سلام لکھیں اور یہ پیغام اس کو پہنچائیں کہ وکالت اللہ میاں بھی کرتے ہیں، وکیل اسماء حسنیٰ میں داخل ہے۔ وکیل اس کو کہتے ہیں، جس پر تکیہ کیا جائے، جو سہارا دے اور دلاسا دے۔ وکالت کے اس پہلو کے بارے میں اعجاز کا کیا خیال ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ہم کو سال میں ایک آدھ خط لکھ دیا کرے۔''

ان اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خطوں کا مجموعی اسلوب کیسا ہے۔ دراصل اسلوب کی یہی جادوگری ہے جو سامنے کی باتوں کو بھی تہ دار بنا دیتی ہے۔ غالب کے انداز میں ڈاکٹر داؤد رہبر نے کہیں کہیں قافیے سے کام لے کر نثر کو شعری آہنگ سے ہم کنار کیا ہے۔ مثلاً ضیاء محی الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یار شوخ و شنگ، قاری خوش آہنگ، ترجمان شان جمشید و ہوشنگ، ناطق انگلیسی بہ لہجۂ افرنگ..... مجھ پر قافیہ کب ہوا تنگ؟'' مگر یہ ان کی نثر کا عمومی انداز نہیں ہے۔

عمومی انداز وہی ہے جس میں وہ نہایت سادگی لیکن پرکاری کے ساتھ اپنے مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ شاہد احمد دہلوی نے اپنی کتاب ''گنجینۂ گوہر'' کا دستخطی نسخہ بھیجا۔ اس کی رسید میں لکھتے ہیں: ''گنجینۂ گوہر کا جزاو نسخہ تشریف لایا، یعنی اس پر آپ کے دستخط ہیں۔ دستخط ثبت فرمانے میں چند لمحے لگتے ہیں، لیکن اس مختصر ارقام میں آپ کی اپنی ہتھیلی، کلائی، انگلیاں سب کارفرما ہیں اور ان کے پیچھے آپ کے خون کی گردش، آپ کے خیال کی گرمی اور آپ کی شفقت کی تحریک، یہ سب شریک ہیں۔ میں اس دستخط کو دیکھتا ہوں تو باغ باغ ہوتا ہوں، گویا آپ کو دیکھ لیا۔''

خطوں کے اس مجموعے میں موضوع کا ایسا تنوع ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کہیں موسیقی کی گفتگو ہے اور کہیں کتابوں کی۔ کہیں گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں ہیں اور کہیں آنے والے لمحوں کا انتظار۔ کہیں شخصیات کو موضوع بنا کر مرقع نگاری کی ہے اور کہیں واقعات و لطائف کے بیان میں گرمیِ گفتار کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے، جیسے لکھنے والا خوشیاں سمیٹنے اور خوشیاں تقسیم کرنے کے لئے قرطاس و قلم سے وہی کام لے رہا ہے جو ایک موسیقار آواز یا ساز سے لیتا ہے۔

ان خطوں کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں جا بجا ایسے تنقیدی اشارات ملتے ہیں جو ایک طرف مکتوب نگار کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں اور دوسری طرف قاری کی رہنمائی بھی کرتے ہیں، مثلاً ایک جگہ ن م راشد کے بارے میں لکھتے ہیں: ''راشد نے تن تنہا جدید شاعری کو کلاسیکی اوج تک پہنچایا۔ حریرو پرنیاں کے دلداروں نے راشد کے پکے راگ کی پوری داد نہ دی۔ راشد مستی کے شاعر نہ تھے، خرد کے شاعر تھے۔ ''لا مساوی انسان'' کے شاعر کی آنکھوں میں خمار نہیں ہے تو بصیرت کی چمک ہے اور اس کے کلام کے ہر حرف میں متانت اور وقار ہے۔''

عبدالعزیز خالد کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''آپ کا تکیجاتی کلام ایسا تھوڑے ہی ہے کہ رسولن بائی نرت کے ساتھ اس کی تان اڑائیں اور بھاؤ بتائیں۔ آپ کا کلام لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا جاتا ہے۔''

ہم اس پر یہ اضافہ کریں گے کہ خالد کا کلام لائبریری کے صرف اس گوشے میں پڑھا جا سکتا ہے جہاں چاروں طرف لغات ہوں تاکہ لغت نویسوں کی روحیں خوش ہوں کہ ان کے جمع کردہ الفاظ کسی کے تو کام آئے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

حفیظ جالندھری ڈوبتے ڈوبتے بچے

پاکستانی افواج کے میجر جنرل فاروقی کی "بڑھاپے کی شادی" نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ راولپنڈی چھاؤنی کے تالاب کے گرد واقع سبزہ زار میں محفل آراستہ کی گئی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو سہرا پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ حفیظ صاحب نے "دولہا" کی عمر کے حوالے سے طنز و مزاح کا پیرایہ اختیار کیا۔ محفل میں شریک فوجی افسروں کو یہ بات ناگوار گزری کہ ایک شاعر ایک میجر جنرل سے تفریح لے۔ انھوں نے حفیظ صاحب کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا۔ حفیظ صاحب ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ پانی کی سطح پر صرف ان کی ٹوپی تیر رہی تھی۔ ایک رحم دل فوجی افسر کرنل مسعود احمد کے دل میں نیکی آگئی اور وہ غرقاب شاعر کو کھینچ کر کنارے پر لائے۔ حفیظ صاحب بھیگے ہوئے کپڑوں میں بھرے ہوئے مائیکروفون کے قریب گئے اور "تم پر لعنت ہو" کہہ کر محفل سے رخصت ہو گئے۔ حفیظ ہوشیار پوری نے حفیظ جالندھری کے اس شعر سے ان کی غرقابی کی تاریخ نکالی۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

یہ ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے۔ اگر چھ سال بعد مارشل لاء کے نفاذ کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آتا تو کرنل مسعود احمد تالاب سے صرف حفیظ صاحب کی ٹوپی نکال کر باہر لاتے اور اُسے فردوسی اسلام کی یادگار کے طور پر قومی عجائب گھر میں محفوظ کر دیا جاتا۔

یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اگر اس کے راوی بزرگ ادیب سیّد ضمیر جعفری نہ ہوتے تو ہمیں ہرگز اس پر یقین نہ آتا۔ جس کتاب میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا نام "حفیظ نامچہ" ہے اور اسی مہینے شائع ہوئی ہے۔

سیّد ضمیر جعفری ہمارے ان سدا بہار ادیبوں میں سے ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ غزل میں اُن کا خاص رنگ ہے اور ان کی مزاحیہ شاعری تو سراپا رنگ ہی رنگ ہے۔ وہ ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام کاغذ اور مائیک دونوں پر یکساں مزا دیتا ہے۔ گو انھوں نے اعلیٰ درجے کی سنجیدہ شاعری کی ہے لیکن مزاحیہ شاعری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ جب کبھی وہ کسی مشاعرے میں سنجیدہ غزل سناتے ہیں تو سامعین اسے مزاحیہ کلام سمجھ کر ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں۔ سیّد صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے بغیر کسی مشاعرے کی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی زندگی میں سیّد صاحب نے جتنے مشاعرے لوٹے ہیں، اتنے تو ملک بھر کے ڈاکوؤں نے بنک بھی نہ لوٹے ہوں گے۔

نثر میں بھی سیّد ضمیر جعفری نے ایک اُسلوب خاص ایجاد کیا ہے۔ انھوں نے شخصیات و واقعات کے حوالے سے اپنی یادوں کو جس انداز سے قلم بند کیا ہے اُس سے اُردو خاکہ نگاری کے قد اور وزن دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ایسے انبار لگائے ہیں کہ موجودہ دور کے تقریباً سبھی طنز و مزاح نگار ان کے خرمن کے خوشہ چین ہیں۔ ترجمے کے میدان میں بھی سیّد صاحب کسی سے پیچھے نہیں بلکہ کبھی کبھی تو اُن غیر ملکی مصنفین سے بھی آگے نکل جاتے ہیں جن کی تخلیقات کو وہ اُردو میں منتقل کرتے ہیں۔

سیّد صاحب کے دو روزنامچے مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو کراماً کاتبین لکھتے ہیں اور دوسرا وہ خود قلم بند کرتے ہیں۔ کراماً کاتبین والا روزنامچہ تو قیامت کے روز دیکھنے کو ملے گا، لیکن سیّد صاحب کا خود نوشتہ روزنامچہ ان کے بہت سے دوستوں کی نظر سے گزر چکا ہے۔ "حفیظ نامچہ" اسی روزنامچے کا خلاصہ ہے۔ اصل روزنامچے کے ایسے حصے الگ کر کے کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں جن میں حفیظ جالندھری کا ذکر ہے۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اُردو میں اس نوعیت کی صرف ایک کتاب اور ملتی ہے اور وہ ہے سیّد نذیر نیازی کی "اقبال کے حضور"۔ لیکن اس میں "حضور" زیادہ ہے اور "اقبال" کم۔ اس کے برعکس حفیظ نامچہ میں سوائے حفیظ جالندھری کے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اور اگر نظر آتا بھی ہے تو حفیظ کی شخصیت کا تابع مہمل بن کر۔ فردوسی اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری کو تو ہم اُن کی تصانیف میں دیکھ لیتے ہیں، لیکن حفیظ عام زندگی میں کیسے تھے، اس کا اندازہ صرف "حفیظ نامچہ" ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

سید ضمیر جعفری خوش قسمت ہیں کہ انھیں حفیظ سے قریب رہنے کا موقع ملا، لیکن حفیظ زیادہ خوش قسمت ہیں کہ انھیں ضمیر جعفری جیسا روزنامچہ نویس ملا جس نے ان کی زندگی کو روز و شب کے آئینے میں اس طرح دکھایا ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے حفیظ کی صرف ٹوپی نہیں پوری شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

حفیظ بہت بڑے شاعر تھے، لیکن وہ آدمی ویسے ہی تھے جیسے عام لوگ ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی خفا ہو جاتے تھے اور کبھی خوش۔ تعریف سن کر چہرہ گلستان ہو جاتا تھا۔ تنقید یا تنقیص سے طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی۔ صاحبانِ اقتدار کی قربت سے خوش ہوتے تھے۔ ہم عصر شاعروں کو طنز کا نشانہ بنا کر انھیں بڑا سکون ملتا تھا۔ اپنی شاعری پر ہی نہیں اپنے پکائے ہوئے سالن پر بھی داد طلب کرتے تھے۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۶ء کا اندراج ملاحظہ کیجیے: ''دن حفیظ صاحب کے ساتھ گزرا۔ بلکہ ان کے چولھے چوکے کے ساتھ گزرا۔ بود و باش کا وہی انداز جیسے حالی کی دکان، سب سے الگ۔ گھر میں ان کا کمرہ الگ۔ خواب گاہ بھی وہی، دارالمطالعہ بھی وہی۔ دیوان خانہ، باورچی خانہ سب کچھ وہیں۔ کوزے میں سمندر۔ نغمہ زار میں ٹماٹر زار۔ آج انھوں نے میرے اعزاز میں دو تین ترکاریاں (بشمول دال مونگ) اپنے ہاتھ سے بنائیں.....

ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں

موجودہ حکومت نے ایک طرف کاغذ اور دیگر سامان طباعت کی قیمتوں میں ناقابل تصور اضافہ کیا ہے اور دوسری طرف اخبارات و رسائل جاری کرنے کے اجازت ناموں سے تمام پابندیاں اٹھالی ہیں، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جمہوری حکومت اظہار رائے کی آزادی کے خلاف ہیں۔ حکومت کا یہ اقدام ایسا ہی ہے کہ جیسے پہلے تو کسی کی زبان کاٹ دی جائے اور پھر اس سے کہا جائے تمھیں بولنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ سنا ہے نئے بجٹ میں اخبارات و رسائل اور دیگر مطبوعات پر ساڑھے بارہ فیصد ٹیکس عائد کیا جانے والا ہے۔ گویا اظہار رائے کی رہی سہی آزادی بھی جمہوریت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں کام آجائے گی۔

آسانی سے ڈیکلریشن مل جانے کی وجہ سے پچھلے ایک برس میں درجنوں نئے اخبارات و رسائل جاری ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر خریداروں کی نایابی، اشتہاروں کی عدم دستیابی اور حالات کی خانہ خرابی کا شکار ہو کر دو ایک شماروں کے بعد ہی دم توڑ گئے یا جان کنی کے عالم میں ہیں۔ کچھ اچھے ادبی رسائل بھی منظر عام پر آئے ہیں، جن میں سے بعض کا تعارف ہم کرا چکے ہیں، ایسا ہی ایک اور رسالہ اس وقت پیش نظر ہے، جس کا نام ''علامت'' ہے۔ یہ ماہنامہ لاہور سے ضیاء جالندھری، امجد الطاف، محمد منشا یاد اور سعید شیخ نے جاری کیا ہے۔ یہ چاروں پختہ کار ادیب ہیں اور ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے یہ رسالہ پاکستان کے ادبی منظر کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

''علامت'' کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص ادبی گروہ کا ترجمان نہیں ہے۔ اسے پاکستان کے ایسے بہت سے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے، جن کی تخلیقات کسی بھی ادبی رسالے کے عمدہ معیار کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ ممتاز مفتی، انتظار حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، عزیز حامد

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

مدنی، جمیل الدین عالی، منیر نیازی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، الطاف گوہر، حمید نسیم، ساقی فاروقی، مرزا ادیب، اشفاق احمد اور ان جیسے بہت سے اہلِ قلم کی تازہ ترین تخلیقات اگر پڑھنے کو مل جائیں، تو پڑھنے والوں کو اور کیا چاہیے۔

''علامت'' کے اب تک پانچ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ یوں تو ان کے تمام مندرجات کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ضیاء جالندھری کے اداریوں نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ ہر شمارے میں کسی اہم موضوع پر نہایت فکر انگیز گفتگو کرتے ہیں۔ ایک اداریہ انھوں نے معاشرے میں ادیب کے مقام کے بارے میں لکھا ہے، اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں.....

''ادیبوں کے ایسے گروہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جو ادبی اقدار کو پس پشت ڈال کر سرکار دربار میں شناخت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں بڑی بھونڈی کوششیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسے ادارے بنائے جاتے ہیں جہاں خصوصی سرکاری سرپرستی کے امکانات زیادہ ہوں۔ بہانے بہانے ادبی اجتماعات میں، کتابوں کی رونمائی کے موقعوں پر خالص فنی جلسوں میں، حکومت کے اعلیٰ اہلکاروں، وزیروں، مشیروں وغیرہ کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بحیثیت صدر مدعو کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر کا ادب اور فنون سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور عموماً یہ حضرات ایسے موقعوں پر اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیں۔ وہ ادیبوں کو سبق دیتے ہیں۔ انھیں بتاتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے، کیا لکھنا چاہیے کیسے لکھنا چاہیے، اور یہ بھی کہ کیا نہیں لکھنا چاہیے۔''

ہمیں تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ سرکاری عہدیدار یا وزیر ادیبوں کی امامت کریں اور انھیں یہ مشورہ دیں کہ کیا لکھنا چاہیے اور کیسے لکھنا چاہیے۔ جن ادیبوں کو اس قسم کے مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے، وہی سرکار دربار سے رابطہ پیدا کر کے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ویسے بھی قصیدہ گوئی ہماری روایت رہی ہے۔ جتنا بڑا شاعر ہوگا، اتنا ہی بڑا قصیدہ گو بھی ہوگا۔ میر، سودا اور غالب سے بڑھ کر کس نے قصیدہ گوئی کی ہے۔ اگر یہ قصیدہ گوئی نہ کرتے، تو ان کے حالات اتنے ابتر ہو جاتے کہ غزل گوئی کی طرف دھیان ہی نہ جاتا۔

جو ادیب سرکاری افسروں اور وزیروں کو ادب شناس سمجھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر ادب کا

نہیں خود اپنا مفاد ہوتا ہے۔ وہ ادب کو وسیلہ بنا کر اہلِ اقتدار کے قریب آتے ہیں تاکہ کچھ فوائد حاصل کر سکیں۔ ادب کی عام طور پر تعریف کی جاتی ہے کہ یہ انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کا ایک وسیلہ ہے۔ اگر کوئی ادیب، جو ظاہر ہے کہ انسان بھی ہوتا ہے، اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

ضیاء جالندھری نے ایک اداریہ اس موضوع پر بھی لکھا ہے کہ ادیبوں کو اپنی کتابیں چھپوانے کے سلسلے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کا سدِباب ہونا چاہیے۔ انھوں نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی ہے، جس کا خلاصہ انھی کے الفاظ میں یہ ہے.....

''کئی ممالک میں..... ادیبوں کو اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے براہِ راست چھاپنے والوں کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ یہ کام نہایت احسن طریقے سے ادبی ایجنٹوں کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے..... یہ نہ صرف حقوقِ اشاعت اور دوسرے متعلقہ قوانین کے ماہر ہوتے ہیں، بلکہ بازار میں کتابوں کی مانگ کے متعلق بھی مکمل آگاہی رکھتے ہیں اور مسودوں کو ادبی سطح پر پرکھنے کے اہل بھی ہوتے ہیں۔ یہ اگر ایک طرف ادیب کے لیے اچھے سے اچھے ناشر سے معاملہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو دوسری طرف ناشر کے مفاد کا بھی پوری طرح خیال رکھتے ہیں..... ان ایجنٹوں کو اپنے کام کا جو کمیشن ملتا ہے، اس سے ان کے روزگار کا معقول بندوبست ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ یہاں اس قسم کی ایجنسیاں قائم کی جائیں، تاکہ ادیب اس مسئلوں سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام توجہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں صرف کر سکیں۔''

ضیاء جالندھری کے ارشادات سر آنکھوں پر، لیکن وہ جن ملکوں کی مثال پیش کر رہے ہیں، وہاں کتابیں ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں، نیز ادیب اور ناشر دونوں پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر ادیب تلمیذ الرحمٰن ہوتے ہیں اور کتابیں چھاپنے کا کاروبار وہ کرتے ہیں، جو کتاب کے سرورق کے ڈیزائن سے اندازہ کرتے ہیں کہ کتاب کا ایڈیشن کیا ہوگا۔ پھر ان ملکوں میں تعلیم عام ہے اور ایک بڑا طبقہ ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی صورت میں یہ توقع رکھنا کہ ادیب اور ناشر کے درمیان ادبی ایجنٹ کا موجود ہونا چاہیے، محض ایک خوش خیالی ہے۔ ہمارے ہاں خود ادیب تو اپنی تخلیقات سے اپنے روزگار کا

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

بندوبست کر نہیں سکتا تو بیچارہ ادبی ایجنٹ کس طرح اتنا کما سکتا ہے کہ روح وتن کا رشتہ برقرار رکھ سکے۔

دو چار ادیبوں کو چھوڑ کر پاکستان میں کوئی ادیب ایسا نہیں ہے، جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کی کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن عام پڑھنے والوں نے خریدا ہے۔ ہمارے بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں اور اپنے دوستوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوست کتاب مفت لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کتاب کو رکھنے کی جگہ مصنف کے گھر میں نہیں اس کتاب کے لیے ہمارے گھر میں گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔

یہ واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک مشہور نقاد نے اپنے مضامین کا مجموعہ بصرف زر کثیر شائع کیا اور عام دستور کے خلاف یہ طے کیا کہ وہ کسی کو اپنی کتاب مفت نہیں دیں گے۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تنقید مفت بھی ملے تو مہنگی پڑتی ہے۔ انھوں نے ایک کتب فروش کو شیشے میں اتارا اور یہ باور کرایا کہ ان کی کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گی۔ کتاب کا پورا اسٹاک انھوں نے کتب فروش کے حوالے کر دیا اور طے پایا کہ سال بھر بعد حساب فہمی ہوگی۔ جب حساب فہمی ہوئی تو کتب فروش نے نقاد کو کچھ دینے کی بجائے ایک خاصی معقول رقم طلب کی۔ نقاد نے اس کی وجہ پوچھی تو کتب فروش نے کہا، ''سال بھر میں آپ کی دو سو روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ آپ کی کتاب کے اسٹاک کو گودام میں رکھنے کا کرایا ایک ہزار روپے ادا کیا گیا۔ اپنے دو سو کاٹ کر باقی آٹھ سو عنایت فرما دیجیے۔''

ساقی کی شاعری ایک اچھا خاصا چڑیا گھر ہے

لندن والے ساقی فاروقی آجکل کراچی میں تشریف فرما ہیں۔ یہ کالم انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے لکھا جا رہا ہے لیکن یہ ایسے وقت میں شائع ہوگا جب ساقی واپسی کے لیے پابرکاب ہوں گے۔ واپسی کے سفر میں ہماری دعائیں، نیک تمنائیں اور یہ کالم ان کے ساتھ ہوگا۔

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

یہ شعر ہم نے ہزار مرتبہ سنا ہوگا اور ہر مرتبہ ہمیں ہنسی آئی کہ وطن سے نکل کر کسی کو عزت کیسے مل سکتی ہے۔ دولت کی بات اور ہے کہ لوگ غیر ملکوں میں محنت مزدوری اور فاقہ کشی کر کے رقم پس انداز کر لیتے ہیں، مگر عزت تو ایسی چیز نہیں ہے جسے پس انداز کیا جا سکے۔ لیکن ساقی فاروقی نے ہمارے اس نظریے کو باطل کر دیا۔ اب ہم اسے تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وطن میں اگر کوئی چیز کسی کے پاس نہ ہو تو وطن سے باہر جا کر وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ ساقی فاروقی جب تک وطن میں تھے، ان کا حال وہی تھا جو ہمارا ہے۔ لیکن لندن کی ہوا انھیں ایسی راس آئی ہے کہ اب ان کا شمار ادبی عزت داروں میں ہوتا ہے۔

بلاشبہ وہ ان دو چار شاعروں میں سے ہیں جنھیں رجحان ساز کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ن م راشد کی طرح روش عام سے ہٹ کر اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ ان کے اسلوب واظہار میں تازگی اور نیا پن ہے اور فکر میں گہرائی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایتی شاعری کے رسیا ساقی کی نظموں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ کم از کم عنوانات کی حد تک پرانے وقتوں کے لوگ ساقی کی نظموں سے خاصے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا تھا، ''ساقی کی شاعری ایک

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

اچھا خاصا چڑیا گھر ہے۔ اس نے مینڈک، سؤر، خرگوش، کتے، بلے اور مکڑے وغیرہ پر خوب نظمیں لکھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کا مشاہدہ ہی نہیں، ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے۔ ساقی کا جواب نہیں کہ اس نے کیسے کیسوں کی صحبت اٹھائی ہے۔"

ہم نے اوپر جو شعر لکھا ہے، اس کا دوسرا مصرع بھی ساقی کے حوالے سے خاصا مناسب حال ہے۔ پورا مصرع نہ سہی "سر پر چڑھنے" والے الفاظ ساقی کے مزاج و کردار کی نہایت عمدگی سے عکاسی کرتے ہیں۔ ساقی جب کراچی میں تھے، نوکری کے جوش میں ہر وہ کام کر جاتے تھے جو کلاسیکی مزاج رکھنے والوں کو پسند نہیں آتا تھا۔ مثلاً ادبی محفلوں میں ساقی کا وجود دہشت گردی کی علامت تھا۔ وہ گالی گفتار سے شروع کرتے تھے اور غالب کے "ڈھول دھپا" والے شعر پر بات ختم کرتے تھے۔ ان کے اس قسم کے واقعات اب بھی بعض لوگوں، خصوصاً پروفیسر مجتبیٰ حسین کو اچھی طرح یاد ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ادبی نشستوں میں ساقی کو صدر بنا دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنا نہیں تو کرسیٔ صدارت ہی کا خیال کریں۔ لیکن ساقی انسانوں کا خیال نہیں کرتے تھے تو کسی کرسی کا کیا خیال کرتے۔ ایک دفعہ وہ حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی نشست کی صدارت کر رہے تھے۔ ایک نقاد نے ضرورت سے زیادہ تنقیدی زور آزمائی کا مظاہرہ کیا۔ ساقی کچھ دیر تو انھیں برداشت کرتے رہے اور پھر اچانک انھوں نے اعلان کیا، "حضرات! میں اس اجلاس کی کارروائی ختم کرتا ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے مذکورہ نقاد کو مخاطب کر کے غیر ادبی زبان میں گفتگو کی۔ جب اپنے دل کی بھڑاس خوب اچھی طرح نکال چکے تو سامعین کو مخاطب کر کے کہا، "حضرات! میں اس اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع کرتا ہوں۔"

ساقی جب لندن چلے گئے تو کراچی کے ادبی حلقوں میں اطمینان کا سانس لیا گیا۔ اب ساقی صرف اسی کے لیے چمن سے نکل کر سر پر چڑھنے والے پھول بنتے جو قسمت کا مارا یہاں سے لندن جاتا۔ ساقی کے اس قسم کے کشتگانِ ناز میں افتخار عارف، احمد فراز اور حبیب جالب شامل ہیں۔ افتخار عارف شریف آدمی ہیں، کبھی کسی سے نہیں بگاڑتے اور ساقی کے ساتھ تو ان کا رویہ اس حد تک نیاز مندانہ تھا کہ انھوں نے ساقی کا ایک انٹرویو بھی لیا تھا جو "رازوں کا بھرا بستہ" میں شامل ہے لیکن افتخار عارف کو یہ نیاز مندی راس نہ آئی بلکہ خاصی مہنگی پڑی۔ جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے۔ جنھیں نہیں معلوم تھا، انھیں ہم اپنے کالموں میں وقتاً فوقتاً بتاتے رہے ہیں۔

فراز اور جالب کا قصور یہ ہے کہ یہ دونوں ایک پرت کی شاعری کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ ان دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔ خود ساقی فاروقی کے جگری دوستوں میں جمال پانی پتی جیسے غزل گو بھی ہیں جن کی شاعری میں سرے سے کوئی پرت ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ساقی نے ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔

پچھلے دنوں لندن کی ایک محفل میں ساقی اور جالب کی ملاقات ہوئی۔ دونوں میں کچھ غیر ادبی قسم کا تبادلۂ خیال ہوا۔ ساقی جلال میں آ گئے اور وہ تمام الفاظ استعمال کر ڈالے جو تحریر میں نہیں آ سکتے۔ محفل میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا وہ اُردو نہیں جانتا تھا۔ وہ حیرت سے ساقی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساقی نے اس انگریز کو مخاطب کر کے کہا، "میں نے اب تک اُردو میں جو کچھ کہا ہے، تمہاری خاطر اس کا ترجمہ انگریزی میں کیے دیتا ہوں۔" اس کے بعد ساقی نے انگریزی میں بھی وہ تمام الفاظ استعمال کر ڈالے جو انگریزی کی لغات میں ملتے ہوں تو ملتے ہوں، کہیں اور دکھائی یا سنائی نہیں دیتے۔

لندن میں یوں تو ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں ہیں لیکن ساقی کے لیے "اپنی زبان" میں ان سے مکالمہ کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ بیچارے وہاں محنت مزدوری کرنے گئے ہیں نہ کہ شعر و شاعری۔ ساقی نے اپنا "شوقِ گفتار" پورا کرنے کے لیے نیا راستہ نکالا اور لوگوں کو خط لکھنے شروع کر دیے۔ یہ خط کس قسم کے ہوتے تھے، اس کا اندازہ ساقی کے پہلے دو مجموعوں میں شامل دیباچہ نما مضمون "غیبت کا شامیانہ" سے ہوتا ہے جس میں ساقی نے اپنے بارے میں دوسروں کی رائیں درج کی ہیں۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ساقی کو لکھا، "تم بیہودہ باتیں مجھے نہ لکھا کرو۔ یہ سب اپنے ہم سنوں کو لکھا کرو۔ میرا خط میرے لڑکے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ بس اسے دھیان میں رکھو اور جو چاہے سو لکھو۔" باقر مہدی لکھتے ہیں، "تمہارا گالیوں سے بھرپور خط ملا۔ گالیاں وہ لوگ لکھتے اور بکتے ہیں جو احساسِ کمتری میں بری طرح مبتلا ہوتے ہیں۔ تم مجھے بلاوجہ گالیاں کیوں دیتے ہو، اور پھر جناب میں رعونت کس بات کی ہے جو زبان خراب کرتے پھرتے ہو۔"

لیکن ساقی کے سبھی مکتوب الیہ ایسے نہیں تھے جو اس کے خطوں سے لطف اندوز نہ ہوتے ہوں، بلکہ بعض کو تو گالیاں کھانے کی ایسی چاٹ لگی تھی کہ ساقی کا اگر کوئی خط شریف آتا تو وہ شکوہ کرتے کہ ساقی نے ان کی خاطر داری میں کمی کر دی۔ مثلاً ساقی نے اسد محمد خان کے ایک خط کا یہ

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

جملہ بھی شائع کیا ہے، ''تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں کیوں نہیں لکھیں؟''

خطوں میں گالیاں لکھتے لکھتے ساقی کو یہ سوجھی کہ کیوں نہ تنقید کو بھی روایت کے حصار سے باہر نکالا جائے۔ سو اس نے ایسے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیے جنھیں پڑھ کر ان لوگوں پر رحم آتا ہے جن کے بارے میں ساقی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ زہرا نگاہ کے پہلے مجموعۂ کلام ''شام کا پہلا تارا'' پر ساقی نے فنون میں جو خط نما مضمون لکھا تھا، اس کے بالکل شروع میں سردار جعفری کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

> ''گرد پوش پر سردار جعفری کی رومانی، مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعر سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لیے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لیے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نظر ان کی شاعری طرح سے اعتماد ہے۔ اگر آپ (زہرہ نگاہ) کا نام قرۃ العین یا مریم ہوتا تو وہ آپ کا رشتہ ایران اور فلسطین سے نکالتے اور بات کا بتنگڑ بناتے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے یہ لکھ کر اپنی شیلف پر رکھ لیا تھا کہ الف نے اپنی شاعری کا آغاز غزل/نظم سے کیا تھا جس میں جذبے اور احساس کی فراوانی تھی..... الف نظموں/غزلوں کی طرف مائل ہوا/ ہوئی۔ اس شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی لے ہے۔ الفاظ نرم اور لطیف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ الف کی جگہ کبھی فہمیدہ، کبھی ساحر، کبھی اختر الایمان اور کبھی زہرا کا نام ڈال دیتے ہیں اور پچھلے چالیس سال سے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔''

ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ سردار جعفری نے ساقی فاروقی کا ضرور کچھ بگاڑا ہوگا ورنہ ایسی باتیں ہرگز نہ لکھی جاتیں۔ عرض یہ ہے کہ جہاں تک بگاڑنے کا تعلق ہے، وہ ساقی ہی کا محبوب مشغلہ ہے۔ بیچارے سردار جعفری کو کہاں فرصت کہ وہ اس قسم کے کام کریں۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو رائے انھوں نے زہرا نگار کے کالم پر دی ہے، اسی کو ساقی فاروقی کے کلام پر چسپاں کر دیں۔

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA

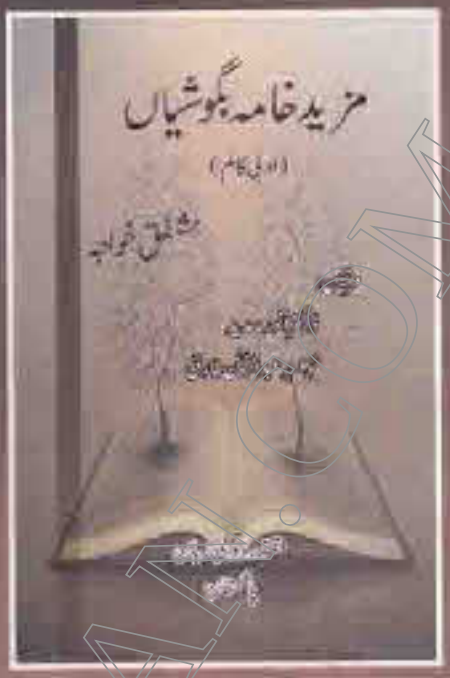

مشفق خواجہ کا احساس مزاح لطیف، تیز اور سبک بھی۔ یہ کانٹے کی اس چبھن کی طرح ہے جس سے خون سطح پر نمودار نہیں ہوتا لیکن چبھن کے بعد ایک کھلا ہوا خوشبودار پھول ہاتھ میں آجاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے طنز و مزاح سے ماحول کی یکسانیت اور فضا کے جمود کو توڑنے کا کام لیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے شخصیت مجروح نہیں ہوتی۔

مشفق خواجہ اردو کے شاید واحد مزاح نگار ہیں جنھوں نے ادب، ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کے ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے اور معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے اور وہ نظم، غزل، افسانہ وغیرہ لکھنے پر بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں صورت حال اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ آج کا ادیب ذہنی کشمکش اور تصادم سے گزرنے کے بجائے مفاہمت، مصلحت اور اہل اقتدار کا شکار ہے۔ ادبی فضا کے اس تضاد نے مشفق خواجہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔

www.nla.gov.pk

www.kitaabistan.com - Karachi-Kuwait-USA